پہیلی
(طاہر جاوید مغل)

سرمد نے اسے اس سے پہلے کہاں دیکھا تھا؟ ہاں......غالباً وہ ولیمے کی شام تھی۔ وہ چمکیلے کپڑوں میں ملبوس، لڑکیوں اور عورتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ سب سے جدا نظر آتی تھی دبلی پتلی، مناسب قد کاٹھ کی۔ بھرے بھرے رخساروں اور بے چین آنکھوں والی۔ نئی نویلی دلہن کی حیثیت سے وہ مرکز نگاہ تھی۔ تاہم سرمد کو لگ رہا تھا کہ وہ دلہن نہ بھی ہوتی تو مرکز نگاہ ہوتی۔

گھر میں ولیمے کی گہما گہمی تھی۔ سرمد ایک بالکونی میں کھڑا تھا اور نیچے صحن کا نظارہ کر رہا تھا۔ شبانہ کی وہ پہلی جھلک تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ اس جھلک کے ساتھ ہی اس کے دل میں کچھ ہوا تھا، کچھ انجانا

سا، کچھ بے نام سا، جیسے سینے میں کسی شے نے کروٹ لی ہو۔ اس شے کو اور اس کروٹ کو وہ کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔ یہ چند لمحے آئے اور گزر گئے۔ وہ پھر سے تقریب کی گہما گہمی میں محو ہو گیا۔ سب کچھ بھول گیا۔

وہ یہاں اپنے ایک پرانے محلے دار عثمانی صاحب کے بیٹے کی شادی پر آیا تھا۔ بیٹے کا نام راحیل تھا۔ وہ کویت میں جاب کرتا تھا۔ راحیل کا ایک بڑا بھائی تنویر بھی تھا۔ ان لوگوں سے سرمد کی فیملی کے گھریلو تعلقات بنے ہوئے تھے...... آج جب راحیل کی شادی پر سرمد یہاں آیا تھا اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس تقریب کے دوران میں .... جب وہ ایک بالکونی میں کھڑا ہو گا چند لمحے ایسے آئیں گے جب اس کے سینے کے اندر کوئی شے کروٹ لے گی اور وہ کہیں کھو جائے گا۔

رات تک وہ تقریب کے ہنگامے میں گم رہا لیکن رات کو جب وہ گھر

آیا اور اس نے اپنے کمرے میں جا کر صوفے کی نرم پشت سے ٹیک لگائی اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی تو ایک دم سے اسے پھر وہی منظر یاد آ گیا۔ وہ خواتین میں گھری کھڑی تھی۔ وہ مرکز نگاہ تھی۔ وہ دلہن تھی۔ وہ دلہن نہ بھی ہوتی تو مرکز نگاہ ہوتی۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جس نے سرمد کو بے تحاشا کشش کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جب ایک ہاتھ اس کے شانے پر آیا اور وہ بری طرح چونک گیا۔ بالکل جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے۔

"کہاں کھو گئے جناب؟" یہ اس کی بیوی تسلیم کی آواز تھی۔ وہ جھکی ہوئی اسکے پہلو میں کھڑی تھی۔ آنکھوں میں شوخی تھی۔

"کک...... کہیں بھی نہیں۔" وہ بولا۔

"کہیں کوئی لڑکی وڑکی تو آنکھ میں نہیں اٹک گئی۔" تسلیم نے شرارت سے کہا۔

''تمہارے ہوتے ہوئے آنکھوں میں اتنی جگہ ہی نہیں کہ کوئی اٹک سکے۔'' وہ سنبھل کر بولا۔ تسلیم کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی اور اس کا بنارسی ساڑھی کو پلو سرمد کے گھٹنے پر پھیلا ہوا تھا۔ کمر کی ملائم جلد ''انرجی سیور'' کی روشنی میں دمک رہی تھی۔ سرمد نے کمر کے گرد بازو حمائل کیا اور اسے صوفے کے ہتھے پر بٹھالیا۔

وہ بال جھٹک کر بولی'' آنکھوں میں گنجائش ہوتی ہے۔ جناب۔ دو پتلیوں میں زمین و آسمان سما جاتے ہیں اور پھر آرٹسٹ کی آنکھیں تو اور بھی وسیع ہوتی ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ ایک میری وجہ سے ان آنکھوں کی گنجائش ختم ہو سکتی ہے۔''

''کچھ بے وقوف لوگ اپنی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہوتے۔'' سرمد نے اسے اپنے اوپر گراتے ہوئے اور اسکے بالوں میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

''اوہو۔ کیا کر رہے ہیں، کاشی جاگ رہا ہے۔''

''جاگ رہا ہے تو کیا ہوا۔ ہم کوئی جھگڑ تو نہیں رہے۔ امی ابو کو وہ شیر و شکر دیکھ کر خوش ہوگا۔''

''اوہو، آپ کے شیر و شکر سے مجھے کچھ یاد آگیا ہے۔'' وہ خود کو سرمد سے الگ کرتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کاشی کو دودھ میں شکر ملا کر دینا ہے۔ وہ سو گیا تو پھر مشکل سے اٹھے گا۔ کاشی ان کے تین سالہ کیوٹ سے بیٹے کا نام تھا۔

دن گزرتے رہے۔ انارکلی لاہور میں سرمد کے والد حاجی سلیم احمد کی قریباً پچاس سال پرانی دکان تھی گارمنٹس کی۔ یہاں خاص طور پر ساڑھیاں فروخت ہوتی تھیں۔ وسیع کام تھا۔ سرمد بھی اس کام میں ہاتھ بٹاتا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی اس کا ایک شوق تھا۔ وہ پینٹنگ

کرتا تھا۔ شروع میں یہ سلسلہ صرف شوقیہ تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس
نے پروفیشن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ لاہور اندرون کی گم ہوتی ہوئی
زندگی کی تصویر کشی میں سرمد کو مہارت حاصل تھی۔ ان کی تصویریں
باذوق لوگوں میں اچھے داموں فروخت ہو جاتی تھیں۔ رسائل و جرائد
میں اس کا ''کام'' نمایاں طور پر چلتا رہتا تھا۔

سرمد کی شادی دور کے رشتہ داروں میں ہوئی تھی۔ تسلیم ایک اچھی بیوی
اور ایک اچھی ماں تھی۔ اس نے سرمد کی زندگی میں محبت کے رنگ
بکھیرے تھے اور سرمد کے ماں باپ کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنا رکھا
تھا۔ سرمد فائن آرٹس کالج کا فارغ التحصیل تھا۔ تسلیم زیادہ پڑھی ہوئی
تو نہیں تھی لیکن اس کا طریقہ اور رنگ ڈھنگ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین
جیسا ہی تھا۔ سرمد کے برعکس وہ خاصی سخت جان بھی تھی وہ ملازماؤں
کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کا اکثر کام کاج اپنے ہاتھ سے کرنا پسند

کرتی تھی۔ خاص طور پر تو سرمد کے کاموں پر تو وہ کسی کا سایہ نہیں
پڑنے دیتی تھی۔ ان کی زندگی بڑی ہموار اور دلنشین طریقے سے رواں
دواں تھی اگر اس ہموار روانی میں کوئی شے قابل ذکر تھی تو وہ.......

بالکونی سے دیکھا ایک منظر تھا۔ یہ منظر دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں
دفن تھا۔ دم سادھ کر بیٹھا ہوا تھا کسی ایسے وقت کا منتظر تھا جب اسے
پھر سے متحرک ہونا تھا اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ واقعی کچھ
ناقابل ذکر چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی جگہ بڑی خاموشی سے رہتی
ہیں اندر ہی اندر پھلتی پھولتی ہیں، اور پروان چڑھتی ہیں اور کسی دن
پتہ چلتا ہے کہ وہ ناقابل ذکر اور معمولی نہیں ہیں۔ وہ غیر معمولی ہیں۔
سرمد اور تسلیم کا اکثر عثمانی صاحب کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ لوگ بھی
مختلف مواقع پر آتے رہتے تھے، کبھی کوئی تہوار، کبھی پکنک، کبھی کسی
بچے کی سالگرہ سرمد کی اہلیہ تسلیم کے برعکس شبانہ کو فنون لطیفہ سے دل

چسپی تھی۔ وہ سرمد کی بنائی ہوئی تصویروں میں کافی دل چسپی ظاہر کرتی تھی اور اکثر ان تصویروں پر جامع تبصرے بھی کرتی تھی۔ اگر وہ کہیں سرمد کی لگی ہوئی یا چھپی ہوئی تصویر دیکھ لیتی تو بطور خاص اسے فون کرتی اور بتاتی شبانہ اور تسلیم میں دوستانہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اکیلی ہوتیں تو پہروں ایک دوسرے سے باتیں کرتیں۔ راحیل کویت واپس جا چکا تھا۔ جاتے جاتے وہ شبانہ کو ایک خوبصورت نشانی دے گیا تھا۔ یہ نشانی کیا تھی؟ اس کا پتہ شبانہ کو بھی نہ تھا۔ اس نے دیکھی ہی نہیں تھی۔ بالکل جیسے کوئی بند پیکٹ دے جائے اور کہہ جائے کہ اسے ابھی کھولنا نہیں۔

اور پھر ایک روز یہ پیکٹ کھل گیا...... ایک نہیں دو نشانیاں تھیں۔ شبانہ دو خوبصورت بچیوں کی ماں بن گئی تھی۔

ماں بننے کے بعد بھی اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہی چھریرا

بدن وہی الھڑ پن، وہی بھرے بھرے رخسار جن پر ایک خواہش آمیز چمک براجمان رہتی تھی۔ ویسے تو تسلیم کی طرح اس کے جسم پہ ہر طرح کا لباس جچتا تھا۔ لیکن ساڑھی پہننے میں اسے ملکہ حاصل تھا اسے ساڑھی میں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ساڑھی کو اس سے بہتر جسم اور اس جسم کو اس سے بہتر ساڑھی نہیں مل سکتی۔

ایک دن سرمد نے تسلیم سے کہہ ہی دیا ”بھئی ! ساڑھیاں ہم بیچتے ہیں لیکن ساڑیاں پہننے کا حق شبانہ ادا کرتی ہے۔

”کیا کہنا چاہتے ہیں آپ“ تسلیم نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

”بھئی ! صاف سیدھی بات ہے وہ بہت اچھی ساڑھی پہنتی ہے۔ حالانکہ یہ مہارت تمہیں حاصل ہونا چاہئے...... کیونکہ تم ساڑیوں والی ہو۔

”گھر کی مرغی دال برابر۔ آپ کو ساری خوبیاں گھر سے باہر ہی نظر آتی

ہیں" وہ مصنوعی غصے سے بولی اور پھر ایکدم اس نے سرمد کی ٹائی پکڑ لی۔ ذرا چونک کر کہنے لگی "لیکن جناب ! آپ کیا کیٹ واک کے جج ہیں جو اتنی باریکی سے ساڑیوں کی اونچ نیچ چیک کرتے ہیں۔"

وہ دفاعی انداز میں بولا" بھئی یہ ہمارے "پروفیشن" کا حصہ ہے ہمیں دیکھنا پڑتا ہے کیسی ساڑھی کیسے جسم پر سوٹ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"لیکن آپ صرف ساڑیاں ہی تو نہیں بیچتے۔ مردانہ لباس بھی بیچتے ہیں۔ اگر میں مردانہ لباس کے سلسلے میں اسی طرح آپ کی مدد کروں تو کیا آپ پسند فرمائیں گے۔"

"باتوں میں تم سے جیتنا ناممکن ہے" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔"

"جو لوگ جلدی سے ہار مان لیتے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ تسلیم نے ٹائی پر گرفت برقرار رکھی۔

"اوہو، ابا جان کی دوا کا وقت ہوگیا ہے۔" سرمد نے اسکی توجہ ہٹانے

کیلئے کہا۔

اس نے جلدی سے سرمد کی ٹائی چھوڑی اور اندر لپک گئی۔ امی ابو کی دوا اور خوراک وغیرہ کا سارا "حساب کتاب" تسلیم کے پاس ہی تھا۔ وہ بھی اس کا نام لے لے کر جیتے تھے۔ تسلیم اس گھر میں یوں رچ بس چکی تھی کہ اس کے بغیر گھر کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔ اس کی چوڑیوں کی کھن کھن اسکی ایڑی کی کھٹ کھٹ........اس کی دل نشین آواز اور اس کے شمع صفت وجود کے بغیر یہ گھر......گھر لگتا ہی نہیں تھا۔

اگلے برس تسلیم نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔ گول مٹول سا ریحان۔ لیکن اس اضافے کے باوجود اس کے گھر کے افراد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ وہ پانچ تھے پانچ ہی رہے۔ سرمد کے والد چند ماہ بیمار رہ کر انتقال کر گئے ان کی بیماری کے دوران تسلیم نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔

والد صاحب کی وفات کو چھ ماہ گزر چکے تھے، ننھا ریحان تین ماہ کا تھا۔ تسلیم چند روز کے لئے میکے جانا چاہتی تھی۔ سرمد نے اسے اپنے چھوٹے بھائی خاور کیساتھ بذریعہ کوچ پنڈی بھیج دیا۔ خاور بھی میٹرک کے امتحان کے بعد فارغ تھا۔ اسے اپنی بھابھی کے ساتھ ہی واپس آنا تھا۔ تسلیم کے جانے کے دو تین دن بعد ہی سرمد اداس ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ اسے چوڑیوں کی کھن کھن اور ایڑیوں کی کھٹ کھٹ یاد آنا شروع ہو جاتی.........رات کو بستر کا خالی حصہ اسے غم زدہ کرتا ۔ لہجے اور جسم کے لوچ ذہن میں چکراتے.........

کاشی کی ہائے ہو یاد آتی۔ وہ بھی اپریل کی ایسی ہی ایک اداس شام تھی سرمد پنڈی فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف شبانہ تھی۔ اس نے بتایا کہ کویت میں راحیل سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ راحیل کے علاوہ اس کا کوئی دوست بھی فون

اٹینڈ نہیں کر رہا۔ وہ سخت پریشانی محسوس کر رہی ہے.........سرمد نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنے ایک ''کویت مقیم'' دوست کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

شبانہ شوہر کے لئے پریشان تھی۔ اس رات تین چار بار سرمد سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ ہوا۔ سرمد اسے تسلی تشفی دیتا رہا۔ بالآخر اگلے روز نو دس بجے کے قریب سرمد کویت راحیل سے بات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ راحیل کے ساتھ بات چیت میں سرمد نے اندازہ لگایا کہ مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے غالباً میاں بیوی میں عام نوعیت کی ان بن ہوئی تھی جس کے بعد راحیل نے ناراضگی دکھائی تھی اور لاہور سے شبانہ کا فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ سرمد نے اپنے طور پر راحیل کو سمجھایا اور اسے کہا کہ سب گھر والے پریشان ہیں وہ جلد از جلد فون کرے سرمد کو یقین تھا۔ کہ اس کا مدبرانہ لہجہ راحیل پر اثر کرے گا۔

اگلے روز شبانہ کا فون آیا اس نے بتایا کہ راحیل سے بات ہو گئی ہے
ساتھ اسنے سرمد کا شکریہ بھی ادا کیا۔ آج وہ پرسکون تھی۔ گفتگو کا رخ
سرمد کی تازہ تصویروں کی طرف مڑ گیا۔ ان میں سے ایک تجریری
تصویر ایک مشہور ادیب کی کتاب پر بطور سرورق شائع ہوئی تھی اور
خوب داد پا رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر جب شبانہ کھنک دار آواز میں
سرمد کی تعریف کرتی تو سرمد کے سینے کے اندر کہیں اس کی انا خوب
انگڑائیاں لیتی اور مسرور ہوتی۔

تسلیم میں سب کچھ تھا لیکن اسکے پاس سرمد کے آرٹ کیلئے یہ تعریفی
نظر اور کھنک دار لہجہ نہیں تھا شبانہ سرمد کی تصویر کے بارے میں بات کر
رہی تھی اور وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔

''کہاں کھو گئے۔ جناب سرمد صاحب ! کہیں سو تو نہیں گئے۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ چونک کر بولا'' وہ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ ہم

دونوں کی ایک رگ ملتی ہے۔ ہم آرٹ میں دل چسپی لیتے ہیں اور اس
پر بات کرنا چاہتے ہیں۔''

'' آرٹ وارٹ کا پتہ نہیں۔ مجھے تو آپ کی تصویریں اچھی لگتی ہیں۔
راہ چلتے دیکھتی ہوں تو اٹک کر رہ جاتی ہوں۔
پرسوں کی بات ہے اپنی دوست انیلا کے ساتھ انار کلی جا رہی تھی۔ ایک
شاپ میں آپ کی پینٹنگ لگی دیکھی تو ایک دم چلتے چلتے رک گئی۔
پیچھے ایک خان صاحب آ رہے تھے۔ دھڑام سے مجھے لگے۔
بڑبڑانے لگے .... انیلا کے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو رہی تھی۔ کہنے
لگی سرمد صاحب کی تصویریں دیکھ کر یوں ایک دم بیچ سڑک میں
بریک لگاؤ گی تو ایکسیڈنٹ تو ہوں گے ....''

سرمد نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا'' تم بہانے بہانے سے
تعریف کرتی رہتی ہو اور میرا خیال ہے کہ جو ایک آرٹسٹ کی تعریف

کرتا ہے اس کے اندر بھی کوئی آرٹسٹ چھپا ہوتا ہے۔شاید تمہارے
اندر بھی۔"

"کیا مطلب؟ مجھے تو برش پکڑنا بھی نہیں آتا۔"

"آرٹ صرف مصوری ہی تو نہیں ہے۔" سرمد نے کہا۔

"مجھے پتہ ہے کہ تم شعر لکھتی ہو میں نے تمہارے چند انگریزی شعر
پڑھے بھی تھے۔"

وہ ہنسنے لگی اس کی ہنسی سے جو صوتی لہریں پیدا ہوئیں وہ سرمد کے بدن
میں دور تک گئیں۔ ہنسی رکی تو وہ بولی" گویا آپ مجھے شاعرہ بنانے پر
تلے ہوئے ہیں، نہیں جناب! میں شاعرہ نہیں ہوں۔ انگلش کی اور نہ
اردو کی۔ وہ تو بس کسی وقت یونہی جب تنہا ہوتی ہوں اور حالات پر
غصہ آتا ہے تو شاعری پر ستم ڈھا لیتی ہوں۔"

شاید وہ مزید گفتگو کرتے لیکن اسی دوران شبانہ کی طرف سے گاڑی کا

ہارن سنائی دیا۔ وہ تیزی سے بولی" میرا خیال ہے کہ خالو آگئے ہیں۔
پھر فون کروں گی۔"

فون بند کرنے کے بعد سرمد تادیر وہیں صوفے پر نیم دراز رہا پتہ نہیں
کیوں اس کے سینے میں ہلکی سی کسک جاگ گئی تھی۔ وہ پوری سچائی
سے اپنی اس کیفیت پر غور کرنے لگا۔ یہ کوئی مثبت کیفیت نہیں تھی۔
اسے لگا جیسے وہ شبانہ اور راحیل کے" ازدواجی ناتے" سے رقابت
محسوس کرنے لگا ہے اپنی گفتگو میں شبانہ جب بھی بیوی کی حیثیت
سے راحیل کا ذکر کرتی تھی وہ اپنے سینے میں ایک ناگوار سی لہر محسوس
کرتا تھا۔ یہ کیا احمقانہ طرز فکر تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک
خود سے الجھتا رہا پھر تسلیم کو فون کرنے بیٹھ گیا۔

قریباً تین سال پہلے سرمد نے جو کچھ بالکونی میں دیکھا تھا وہ اس کے
اندر گہرائی میں موجود تھا اور دھیرے دھیرے پروان چڑھ رہا تھا اپنی

جگہ بنا رہا تھا لیکن وہ بے خبر تھا۔

چار پانچ ماہ بعد ایک ایسا موقع آیا کہ سرمد اور تسلیم کو عثمانی صاحب کے گھرانے کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کے لئے بذریعہ ٹرین کراچی جانا پڑا۔ انہیں وہاں چار پانچ دن رہنا تھا۔ عثمانی صاحب کے دونوں بیٹے گھر سے باہر تھے راحیل تو ظاہر ہے کویت میں تھا تنویر اپنے دفتری کام کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ عثمانی صاحب اپنی بیوی اور چھوٹی بہو شبانہ کیساتھ کراچی جا رہے تھے ادھر سے سرمد تسلیم اور بچے تھے۔

سفر میں ایک دوسرے کو تفصیلی طور پر جاننے کا موقع ملتا ہے۔ قربتیں بڑھتی ہیں اور ایسے واقعات وجود پاتے ہیں جنہیں بعد میں خوشگوار یادوں کی صورت میں ڈھلنا ہوتا ہے یہ سفر بھی بے حد خوشگوار رہا۔

شبانہ کی دونوں بچیاں اب ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی ہو چکی تھیں۔ بڑے

شرارتی اور دلچسپ چیزیں تھی۔

سفر کے دوران شبانہ کا آرٹسٹک رجحان اور بھی کھل کر سامنے آیا۔ وہ خوش گفتار بھی تھی ہنستے ہوئے اس کے فربہ رخسار کچھ اور بھی دلکش ہو جاتے تھے یوں لگتا تھا کہ زندگی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن اس کا ساتھی اس سے بہت دور بیٹھا تھا اور کبھی کبھی تو سرمد کو لگتا تھا کہ اس کا ساتھی اس کا ہم مزاج بھی نہیں ہے۔ اسے فنون لطیفہ سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ شبانہ اپنے فون کالوں میں اکثر اس امر کا شکوہ بھی کرتی رہتی تھی۔

فنون لطیفہ کے معاملے میں تو شاید سرمد صاحب کے گھر کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا تسلیم اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود اس معاملے میں کوری ہی تھی۔ پینٹنگز کو سمجھنا اس کے بس سے باہر تھا خاص طور سے تجریدی پینٹنگز کو دیکھ کر وہ صرف سر دھنتی تھی یعنی معاملہ کچھ یوں تھا کہ شبانہ اور

سرمد دونوں کے لائف پارٹنر کچھ ایسے تھے کہ ان کی تخلیقات کو سراہ نہیں سکتے تھے سرمد کو یوں لگنے لگا تھا کہ مزاج کے اعتبار سے اس کے دل میں کوئی گوشہ خالی ہے اور یہ گوشہ شبانہ غیر محسوس انداز سے پر کرنے لگی ہے۔

سفر کے دوران بھی وہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہے باتیں کرتے رہے۔ جب وہ دونوں باتیں کرتے تو آس پاس کے ماحول کو فراموش کر دیتے۔ ایسے میں ایک دو بار سرمد کی نگاہ تسلیم پر پڑی وہ کھوجنے والی نگاہوں سے سرمد کو تکتے پائی گئی اور یہی کیفیت سرمد نے عثمانی صاحب کی آنکھوں میں بھی دیکھی۔ وہ جیسے چونکنے سے ہو گئے تھے۔ سفر کے دوران میں شبانہ کی ساس آنٹی زینب نے تو شبانہ کو ایک دو بار جھڑکا بھی۔ ایک بار وہ غصے سے بولی ''شبو! تم باتوں میں مگن ہو، کرن دیکھو کہاں پہنچی ہوئی ہے۔ کرن اور ثمن۔ شبانہ کی

جڑواں بیٹیوں کے نام تھے۔

پھر ایک دفعہ وہ شبانہ کو سرمد کے قریب بیٹھے دیکھ کر بولیں ''گرم چادر اوڑھ لو۔ کس طرح ننگے پنڈے بیٹھی ہو۔ سردی لگ جائے گی۔''

سرمد نے چور نظروں سے دیکھا، اسے واقع چادر اوڑھنی چاہئے تھی۔ ساڑھی اس کے ہیجان خیز جسم پر پیاز کے چھلکے کی طرح نظر آتی تھی۔ شادی کی تقریب میں ایک صاحب سرمد کے فین نکل آئے۔ انہوں نے سرمد کی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیئے۔ سرمد انکساری سے مسکراتا رہا۔ اس گفتگو کے دوران سرمد کی نگاہ شبانہ کی طرف اٹھ گئی۔ اس کا چہرہ گلنار نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ جیسے سرمد کی نہیں خود اس کی اپنی تعریفیں ہو رہی ہوں۔

اگلے روز وہ کلفٹن کی سیر کے لئے گئے سب نے خوب انجوائے کیا شوریدہ سر سمندر کو دیکھ کر سارے ہی جوش میں آ گئے۔ اٹھکیلیاں کرنے

لگے۔ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے۔تسلیم نے بھاگتے بھاگتے
سرمد کو ریت پر گرا دیا۔خاور کے ساتھ مل کر بہت سی ریت اس کے
گریبان میں گھسیڑ دی۔جواباً سرمد نے ننھے کاشی کے ساتھ مل کر اس
کے ملتا جلتا سلوک تسلیم کے ساتھ کیا۔وہ ہنس ہنس کر گلابی ہونے لگی
وقتی طور پر وہ اس تناؤ کو بھی بھول گئی جو شبانہ اور سرمد کے رویئے کے
سبب وہ محسوس کر رہی تھی۔

ترنگ و مستی کے اس کھیل میں شبانہ کی بچیاں بھی شریک تھیں۔لیکن وہ
خود بالکل الگ کھڑی تھی۔سرمد کی نگاہ ان لمحوں میں اس کی طرف اٹھ
گئی۔ایک ڈھلان پر کھڑی وہ بالکل خاموش اور اداس نظر آئی۔ایک
مرمریں مجسمے کی طرح ساکت و جامد۔وہ لوگ جب پکنک اسپاٹ
سے واپس آئے تو وہ اپنی ایک بچی کے ساتھ سب سے پیچھے آرہی
تھی۔الگ تھلگ کھوئی ہوئی سی۔پتہ نہیں کیوں سرمد کو ''گلٹی'' سا

محسوس ہوا۔اسے لگا کہ اسے اور تسلیم کو ایک دوسرے میں مگن دیکھ کر
شبانہ کو اپنی تنہائی اور شدت سے محسوس ہوئی ہے۔اسے اپنا جیون
ساتھی یاد آیا ہے۔جو اس سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہے۔

کراچی سے واپسی پر شبانہ اور سرمد کی فون کالوں میں مزید اضافہ ہو گیا
کال کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز بنتا ہی رہتا تھا۔چھوٹی کرن بیمار ہوئی تو
شبانہ اسے اپنی سوزوکی میں ڈال کر سیدھا سرمد کے پاس لے آئی
یہاں سے سرمد اسے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔چند
دن کے علاج معالجے کے بعد کرن بہتر ہو گئی۔تاہم انکل عثمانی اور
آنٹی زینب کو بہو کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔انکل عثمانی نے دبے لفظوں
میں شبانہ سے کہہ بھی دیا کہ ہم سب کے ہوتے ہوئے کرن کو سرمد
کے پاس لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔

اس واقعے کے بعد سرمد نے ایک اور بات بھی نوٹ کی۔شبانہ جب

بھی ان کے گھر آتی تھی ان کے ساتھ انکل عثمانی ضرور ہوتے تھے۔

بظاہر انکل کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن وہ ذرا سے محتاط ضرور دکھائی دینے لگے تھے۔

کرن کی علالت والے معاملے کے بعد شبانہ اکثر کرن کے حوالے سے ہی فون کرتی تھی......کبھی اس کی بات تسلیم سے ہوتی تھی کبھی سرمد سے ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں لاہور کی ایک مشہور آرٹ گیلری میں سرمد کی تصویروں کی نمائش کا پروگرام بنا۔ اس نمائش کے لئے سرمد کو دو تین ماہ کے اندر اندر چند تصویریں اور بھی بنانا تھیں۔

ان تصویروں کے لئے اس نے رات دیر تک کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایزل کو سٹڈی روم میں ہی اٹھا لے آیا یہاں وہ ہلکا سا میوزک لگا لیتا اور برش کینوس کیساتھ شروع ہو جاتا۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ شبانہ کا فون آتا اور وہ دس پندرہ منٹ اس سے باتیں کرتی۔ یہ باتیں زیادہ تر مصوری کے بارے میں ہی ہوتی تھیں۔ یہ باتیں سرمد کو شروع میں تو دلچسپ لگیں۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے ان ایک ہی جیسی باتوں سے اکتانا شروع کر دیا۔ ایک دن وہ بولا، بھئی! تم میرے بارے میں ہی بات کرتی رہتی ہو کچھ اپنے بارے میں بھی تو کہو۔“

”کیا کہوں؟“ وہ لوچ دار آواز میں بولی۔

”اچھا اپنے کچھ انگریزی شعر سناؤ۔

”نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں لگتا......باجی تسلیم پاس ہوں گی تو پھر سناؤں گی۔“

”اگر تم باجی تسلیم کے بغیر دنیا بھر کی باتیں کر سکتی ہو تو پھر شعر بھی سنا سکتی ہو۔“ سرمد نے پتہ نہیں کس جذبے کے تحت اسکی حوصلہ افزائی کی۔

سرمد کو حیرت ہوئی جب وہ برائے نام تذبذب کے بعد تیار ہوگئی۔ وہ اپنی ڈائری تلاش کر کے لائی۔ اور منتخب شعر سنائے۔ انگریزی پر اسے عبور حاصل تھا اور مغربی شاعری کا ڈھنگ بھی آتا تھا پہلے اس نے ورڈز ورتھ کے انداز میں کہے گئے وہ شعر سنائے جس میں قدرت کی خوبصورتیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس تمہید کے بعد وہ شعر آئے جن میں رومانیت تھی۔ کسک تھی اور چبھن تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی جھجک دور ہوتی چلی گئی اور اس نے وہ شعر بھی سنا دیئے جن میں جسم تھا جسم کی تڑپ تھی اور آگ تھی۔ چیختے چنگھاڑتے جذبے تھے۔ ایسے کچھ شعروں کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

اور جب دیکھ لیتی ہوں تو اور بھی ترستی ہوں......

کالی لمبی راتوں میں کوئی یاد آتا ہے

صبح دم میرے بستر پر

سینکڑوں سلوٹیں ہوتی ہیں.

اتنی سلوٹیں اور ایک جسم......

پھر ایک شعر کا مطلب کچھ یوں تھا

دروازے بند کرنے سے ڈر دور نہیں ہوگا

ڈر تو اور بڑھ جائے گا

کیونکہ چور دل کے اندر ہے

وہ دیر تک سناتی رہی اور وہ سنتا رہا۔ اس کی آواز خواب ناک اور بھرائی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سے چمک تھی لہجے کے زیر و بم میں۔

وہ چپ ہوئی تو سرمد نے کہا" یہ ساری شاعری کس کیلئے ہے؟"

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

سرمد نے ایک گہری سانس لی" اسی کیلئے جو تم سے دور ہے۔

........راحیل۔"

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی" ہاں ان کے لئے........ اور شاید کسی
اور کے لئے بھی۔"

"کوئی اور بھی تھا؟"

"وہ ہنسی" کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تو ہوتا ہے ناں۔"

"کوئی کالج کا ساتھی؟ یا کوئی کزن؟"

وہ پھر ہنسی "نہیں آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ضروری تو نہیں شاعری
صرف اسی ایک ہی حوالے سے کی جائے۔"

"تو پھر کیا حوالہ ہے؟"

"بتانا ضروری ہے۔"

"اتنا ضروری بھی نہیں۔ بلکہ شاید...... میرا حق بھی نہیں پوچھنے کا۔"

اس مرتبہ اس کی ہنسی میں ہلکی سی معذرت تھی اور لاڈ تھا۔

"اوہو، آپ تو ناراض ہونے لگے ہیں چلئے میں بتاتی ہوں۔ بس یہ

شاعری ایک خیالی شخص کے لئے ہے۔ وہ ایک سایہ سا ہے دھند میں
لپٹا ہوا میرے سامنے رہتا ہے۔ کبھی بھی اسے ٹھیک سے دیکھ نہیں پائی
ہوں۔"

اگلی ٹیلیفونک ملاقات میں بے تکلفی کا رنگ کچھ مزید گہرا ہوا..... جھجک
کچھ اور کم ہوئی شبانہ کے شعروں کی بات ہی ہو رہی تھی۔ سرمد نے کہا
ایک مرتبہ اپنے گھر پر تمہیں گنگناتے سنا تھا۔ شاید تم اکثر گنگناتی ہو۔"

"میں اب بھی گنگنا سکتی ہوں۔" اس نے کہا اور سرمد حیران رہ گیا۔ وہ
تیزی سے "آگے بڑھ" رہی تھی۔

اپنے سینے کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے سرمد نے کہا "تو گنگناؤ
بھئی۔"

"کیا؟" وہ مسکراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اپنے یہی شعر گنگنا دو۔"

"نہیں......شرم آرہی ہے۔"

سرمد نے بس ایک بار مزید کہا اور وہ تیار ہوگئی۔

چند سیکنڈ تک فون لائن پر خاموشی رہی پھر ایک باریک نا قابل شناخت اور خوبصورت آواز ریسیور پر ابھری۔ وہ گا رہی تھی۔ اس کی اپنی ہی انگریزی شاعری تھی اس کی شاعری بس واجبی سی تھی لیکن اس کی آواز واجبی سی نہ تھی آواز کی وجہ سے شاعری اچھی لگنے لگی تھی اور سرمد توجہ سے سننے لگا۔ مصرعوں اور شعروں کے درمیان جب وہ سانس لینے کیلئے رکتی تو سرمد داد دیتا اور تعریفی الفاظ استعمال کرتا "گڈ...... نائس........ونڈرفل۔"

دو نظمیں ختم ہوئیں تو شبانہ نے اپنی دلنشین آواز میں پوچھا۔

"بس؟"

"نہیں۔ تھوڑا سا اور۔" سرمد نے کہا۔

وہ مزید سنانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس نے پوچھا بس؟"

"نہیں چند شعر اور۔" سرمد نے کہا۔

اسے محسوس ہوا کہ اسے شبانہ کی شاعری سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی اسکی آواز سے ہے اور اسکی موجودگی سے ہے۔

وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں حیرت تھی۔ خواہش انگیزی تھی شاید ایسی ہی خواہش انگیزی جو اس کے بھرے بھرے رخساروں کی چمک میں تھی۔

"نہیں سرمد دیر ہوگئی ہے۔ کرن اور ثمن میں سے کوئی جاگ گئی تو شور مچا دے گی۔"

"........اور پھر انکل عثانی جاگ جائیں گے اور انکل عثانی سے تم ڈرتی بہت ہو؟"

"ڈرنا تو پڑتا ہے نا۔" وہ ہنسی۔

"چلو پھر........باقی کل۔"

’’یعنی آپ نے طے کرلیا ہے کہ ہر روز بات ہونی ہے۔‘‘

سرمد نے چونک کر کہا ’’واقع میری بات کا مطلب تو یہی نکلتا ہے۔‘‘

’’خیر یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں ہے۔‘‘ اس نے گداز لہجے میں کہا ’’مجھے لگتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہوتی جارہی ہے۔‘‘

فون بند کرنے کے بعد سرمد دیر تک سوچتا رہا۔ شبانہ کا آخری جملہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا...... ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہوتی جارہی ہے اس جملے کی کئی پرتیں تھیں اور ہر پرت کے اندر ایک سنسنی کی لہر سی تھی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی گفتگو پر غور کرنے لگا جیسے وہ ایک ٹین ایجر تھا اور ایک ٹین ایجر سے مکالمہ کررہا تھا، ہر گزرنے والے دن کے ساتھ شبانہ ایک نئے رنگ سے سامنے آرہی تھی۔ یہ نیا رنگ پہلے رنگ سے گہرا اور واشگاف ہوتا تھا۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اسے سنانے کے لئے فون پر گانا شروع

کردے گی اس کا ہر روز مقررہ وقت پر فون کرنا بھی معنی خیز تھا۔

’’اگلے روز اس نے مقررہ وقت پر فون کیا تو وہ کچھ جلدی میں محسوس ہوتی تھی۔ ’’کیا بات ہے؟‘‘ سرمد نے پوچھا۔

’’خالو ابھی جاگ رہے ہیں گاؤں سے ان کے ایک دوست ملنے آئے ہیں شام سے پرانی باتیں لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب ان کی آوازیں بھاری بھاری ہوتی جارہی ہیں اور لگتا ہے کہ تھوڑی دیر میں سو جائیں گے۔ پھر فون کروں گی وہ ذرا شوخی سے بولی۔

’’ٹھیک ہے، میں فون کے پاس ہی ہوں‘‘ سرمد نے کہا۔

’’مجھے پتا ہے۔‘‘ وہ ہنسی۔

فون بند کرکے سرمد ایزل کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پائلٹ اور دوسرے میں برش تھا کینوس پر ایک تجریدی تصویر کے نقوش تھے۔ الجھی الجھی لائنیں تھیں۔ بکھرے بکھرے رنگ تھے۔۔

یوں لگتا تھا کہ رات کے ایک ''پریشان پہر کو'' تاریک آسمان کے پیش نظر میں بکھیر دیا گیا ہو۔ وہ برش ہاتھ میں لئے تصویر کے سامنے بے حرکت کھڑا رہا۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا شاید انہیں واقعی ایک دوسرے کی عادت ہوگئی تھی۔ وہ دیر تک انتظار کرتا رہا اسٹڈی کے طول و عرض میں بے چین ٹہلتا رہا وال کلاک کی سوئیاں ٹک ٹک کی مسلسل آواز سے آگے بڑھ رہی تھی۔ رات کا تیسرا پہر شروع تھا۔ سرمد کی نگاہیں بار بار فون سیٹ کی طرف اٹھتی تھیں لیکن وہ خاموش تھا اس کا دل چاہا کہ شبانہ کو فون کرے لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ ان دونوں کے درمیان جیسے یہ طے ہو چکا تھا کہ فون شبانہ ہی کرے گی۔

دل میں عجیب وسوسے سر اٹھانے لگے۔ کہیں یہ نہ ہو......... کہیں یہ نہ ہو......'' انکل عثمانی کی صورت بار بار نگاہوں میں گھومنے لگی۔ کہیں انہوں نے شبانہ سے کوئی سخت بات نہ کہہ دی ہو۔ قریبی کمرے سے

ریحان کے رونے کی آواز آئی۔ چند لمحے بعد تسلیم کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ وہ اسے پچکار رہی تھی۔ سینے سے لگا کر تھپک رہی تھی۔ ریحان کی آواز مدہم پڑنے لگی۔ پھر تسلیم نے سرمد کو پکارا

''سنئے......... کیا کر رہے ہیں۔ کتنا کام باقی ہے؟''

''کافی ہے......... تم سو جاؤ۔'' سرمد نے کہا۔

''کتنے بجے ہیں؟'' تسلیم نے خمار آلود آواز میں پوچھا۔

''دو......... ڈھائی۔'' سرمد نے پندرہ منٹ کم کر کے بتائے۔''

''افوہ......... اتنی دیر ہوگئی۔ پلیز آ جایئے ناں۔ اتنا کام ٹھیک نہیں۔''

اسکی آواز میں کسلمندی تھی۔ اور بستر کے خالی رہ جانے والے حصے کیلئے پریشانی تھی۔

''اچھا ابھی آجاتا ہوں۔ تم سو جاؤ۔''

کچھ دیر بعد ریحان چپ ہو گیا......... اور اس کی ماں بھی چپ ہوگئی۔

بس وال کلاک کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔ وہ سوچتا رہا۔ اس نے ابھی تک فون کیوں نہیں کیا۔ کہیں فون خراب تو نہیں ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ شبانہ کے فون کی گھنٹی بجا کر دیکھے۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے ہاتھ فون سیٹ کیطرف بڑھے۔ یہی وقت تھا کہ جب گھنٹی بج اٹھی۔ سرمد نے گھنٹی کی آواز مدہم کر رکھی تھی بس وہ کمرے کے گوشے میں ہی گنگنا کر رہ گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف شبانہ ہی تھی۔

''وہ دبی دبی آواز میں ہنسی'' ابھی تک جاگ رہے ہیں۔''

''تم جو جگا رہی ہو۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

''خالو جان اور اس کے دوست نے تو نہ جانے کب تک جاگنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ نوکر نذیر کو بھی اپنے ساتھ جگا رہے ہیں۔ دو مرتبہ اس سے چائے بنوا کر پی چکے ہیں۔ سگریٹ بھی پھوکے جا رہے

ہیں۔ وہ تقریبا سرگوشی میں بول رہی تھی۔

''تو تم نے پہلے ہی بتا دینا تھا۔ میں انتظار نہ کرتا رہتا۔''

''میں سوچتی رہی شاید اب سو جائیں.........اب سو جائیں۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی بات کرنے کیلئے بے چین رہی ہے۔

کل دوبارہ فون کا کہہ کر شبانہ نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس گفتگو میں سرمد کو جو سب سے مزیدار چیز لگی تھی وہ شبانہ کا رازدارانہ لہجہ تھا۔ وہ سرگوشی میں بول رہی تھی تا کہ آواز خالو جان کے کمرے تک نہ پہنچے۔ وہ اس لب و لہجے پر غور کرتا رہا اور اسکے بدن میں ایک میٹھی میٹھی سی لہر جاگتی رہی۔

اب ان دونوں کی ''ٹیلیفونک گفتگو'' ایک لگا بندھا معمول بن گیا۔ تسلیم جلدی سونے کی عادی تھی۔ ویسے بھی اسے صبح سویرے کاشی کو تیار کر کے اسکول بھیجنے کی فکر ہوتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے

گیارہ بجے سو جاتی تھی۔ بارہ بجے کے قریب تسلیم کا فون آجاتا۔ سرمد اس وقت اسٹڈی میں اپنے ایزل کیسامنے ہوتا تھا۔ فون کرنے کے بعد وہ پائلٹ اور برش وغیرہ ایک طرف رکھتا اور صوفے پر نیم دراز ہو جاتا۔ انکی بات چیت کا آغاز ہوتا اور پھر ان کی بات چیت طویل ہوتی چلی جاتی۔ ہر قسم کے موضوعات زیر بحث آتے زیادہ تر شبانہ ہی بولتی تھی۔ اس کا اہم موضوع سرمد کی مصوری ہی ہوتی تھی یا پھر وہ اپنے حالات پر بولتی تھی۔ اپنے بچپن اور لڑکپن کے واقعات بیان کرتی تھی۔ اپنے خاندان میں رشتے داریوں کے جھگڑے ساس بہو کے تنازعات، چچاؤں پھوپھاؤں اور ماماؤں کے مسائل سب کچھ اس گفتگو میں شامل ہوتا ان میں سے کچھ موضوعات سرمد کے بالکل غیر دلچسپ ہوتے لیکن وہ پھر بھی ذوق وشوق سے سنتا رہتا تھا۔ اس کا اصل مقصد تو شبانہ کی آواز سنتے رہنا اور اس کی پرحرارت ہنسی سے

لطف اندوز ہونا ہوتا تھا اس طویل گفتگو کے درمیان گاہے بگاہے زیادہ دلچسپ مرحلے بھی آتے تھے۔ بالکل جس طرح ٹی وی وغیرہ پر کم دلچسپ پروگراموں کے درمیان وقفے وقفے سے موسیقی کا اہتمام کیا جاتا تھا تاکہ ناظرین بور نہ ہو جائیں۔ ٹیلی فونک گفتگو کے دوران میں سرمد کی فرمائش پر شبانہ گنگنانا شروع کر دیتی تھی۔

کبھی ورڈز ورتھ یا کیسٹ کی کوئی نظم .... کبھی اپنی شاعری اور کبھی اردو کی کوئی غزل۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ رات بارہ بجے سے صبح چھ بجے تک باتیں ہی کرتے رہتے ریسیور کان سے لگائے لگائے سرمد کے کان دکھنے لگتے۔

ایک کان تھک جاتا تو وہ ریسیور دوسرے کان سے لگا لیتا۔ لیکن یہ دکھن اچھی لگتی تھی۔ یقیناً شبانہ کو بھی اچھی لگتی ہو گی۔ گفتگو کے دوران وہ کبھی

بیٹھ جاتا کبھی نیم دراز کبھی دراز ہو جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب وہ دراز ہوتا تو دوسری طرف شبانہ بھی دراز ہوتی۔ وہ تصور کرتا وہ کس طرح لیٹی ہوگی۔ اس نے ریسیور کیسے تھام رکھا ہوگا اس کا سر کس زاویے پر ہوگا۔ اس کے جسم کی ترکیب کیا ہوگی۔ ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا ''کہاں لیٹی ہو؟''

''براؤن صوفے پر''

''وہ جو فوارے والی کھڑکی کے پاس ہے؟''

''ہاں وہی۔'' وہ دبی دبی آواز میں ہنسی اور آپ چند لمحے توقف سے اس نے پوچھا۔

''میں قالین پر ہوں۔ سر کے نیچے نیلے صوفے کے دو کشن ہیں۔''

''کتنے عادی ہو گئے ہیں ہم ایک دوسرے کے۔'' وہ عجیب آواز میں بولی۔

''دیکھے بغیر ہی مجھے اندازہ تھا کہ آپ قالین پر ہوں گے اور آپ سر کے نیچے صوفے کے دو کشن ہوں گے۔''

''شاید ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے بھی اندازہ تھا کہ تم براؤن صوفے پر لیٹی ہوگی۔''

چند لمحے تک لائن میں خاموشی رہی لیکن پھر شبانہ کی جھجکی ہوئی لیکن پر اشتیاق آواز ابھری ''کس کروٹ پر لیٹے ہیں آپ؟''

''بائیں کروٹ پر۔'' وہ ہنسا ''اور تم؟''

''میں دائیں پر۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

اچانک سرمد کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس کے بدن میں میٹھے درد کی لہریں جاگ گئیں۔ یہ احساس بچگانہ تھا اس کے باوجود سرمد کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں تھیں اسے لگا جیسے وہ ایک ہی جگہ پر ایک دوسرے کے سامنے لیٹے ہوں۔ باتیں کر رہے ہیں بلکہ سرگوشیاں کر

رہے ہیں۔

"کیا سوچنے لگے ہیں؟" جوہر ٹاؤن کے دور افتادہ بنگلے سے شبانہ کی آواز تاریک فضاؤں میں تیرتی ہوئی سبزہ زار کالونی سے اس گھر میں پہنچی۔

"سوچ رہا ہوں۔ ہم کتنے دور ہیں۔ لیکن کتنے قریب بھی ہیں۔

"ہاں۔ بہت قریب.... ایکدوسرے کی سانسوں کی آواز بھی سن سکتے ہیں۔" وہ چنچل ہنسی کیساتھ بولی۔

"وہ واشگاف ہوتی جارہی تھی۔ ایک ریلا سا تھا جس میں وہ بہہ رہی تھی اور سرمد بھی بہتا چلا جارہا تھا۔ صرف دس پندرہ میٹر کے فاصلے پر ایک دوسرے کمرے میں اس کی "محبت کرنے والی بیوی محوخواب تھی اور دونوں من موہنے بچے سو رہے تھے۔ اس طرح جوہر ٹاؤن کے اس بنگلے میں بھی یہی صورت حال تھی۔ جس نشست گاہ سے شبانہ فون

کررہی تھی اس کیساتھ والے کمرے میں اس کی بچیاں سوئی ہوئی تھیں۔ اس کے اگلے کمرے میں اس کے خالو جان تھے۔ اس کے جیٹھ اور جیٹھانی بھی اسی گھر میں تھے۔

یہ کیا ہورہا تھا سرمد نا سمجھ نہیں تھا۔ سب کچھ جانتا بوجھتا تھا اور یہ بھی اسے معلوم تھا کہ حالات کس رخ پر جارہے ہیں.........فی الحال شبانہ اور وہ دوست تھے لیکن ان کی دوستی بتدریج کسی اور طرف جارہی تھی۔ وہی جانا پہنچانا مقام جو عموماً مردوزن کی دوستی کی منزل ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ غلط تھا۔ قطع طور پر ناقابل قبول تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ہورہا تھا۔ ایک روز علی الصبح تسلیم نے کہہ ہی دیا "کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں آپ کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کی نیند پوری نہیں ہوتی۔"

"ہاں.....کام زیادہ ہے۔ کئی دفعہ تو سوتے سوتے تین بج جاتے

ہیں۔"

"پرسوں تو میں نے دیکھا تھا کہ آپ چار بجے تک جاگ رہے تھے۔"

"کک........کیا کر رہا تھا؟"

"صوفے پر لیٹے ہوئے تھے۔ شاید کسی کا فون سن رہے تھے۔"

سرمد کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی جلدی سے سنبھل کر بولا "اپنے پروفیسر مزمل صاحب کا فون آ گیا تھا۔ وہ بھی میری طرح آج کل کام میں جتے ہوئے ہیں۔"

ایسے موقعوں پر تسلیم اکثر کوئی ہلکا پھلکا فقرہ کہہ دیا کرتی تھی۔ مثلاً مجھے معلوم ہے کہ آپ کی کس قسم کے "پری فیسروں" کے فون آتے ہیں۔

........یا اس قسم کی کوئی اور بات۔ لیکن اس بار تسلیم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس اتنا بولی تھی "کام تو آپ بہت کرتے ہیں لیکن تصویریں آپ نے دو تین ہی بنائی ہیں۔

"نہیں بھئی، دو تصویریں تو میں دفتر لے جا بھی چکا ہوں........پھر بھی تمہاری یہ بات درست ہے کہ کام کی رفتار آہستہ ہے۔"

دو تصویروں کے حوالے سے اس نے جھوٹ ہی بولا تھا۔

اگلی رات شبانہ نے بتایا کہ وہ خالو عثمانی کیساتھ چار پانچ روز کیلئے ملتان جا رہی ہے۔ اب اگلی بات چیت ایک ہفتے بعد ہی ہو سکے گی۔ وہ یوں اطلاع دے رہی تھی جیسے اجازت مانگ رہی ہو۔ اسکا یہ انداز سرمد کو اچھا لگا۔ عجیب سی اپنائیت تھی اس لہجے میں........سرمد بولا" شکریہ کہ تم نے پیشگی اطلاع دے دی۔ ویسے اسکی ایسی ضرورت تو نہیں تھی۔"

"کس کی ضرورت نہیں تھی؟"

"یوں خصوصی طور پر فون کر کے اطلاع دینے کی۔ اور یوں اطلاع دینے کی جیسے اجازت مانگی جاتی ہے۔ تم اپنے معاملات میں پوری

طرح آزاد ہو بھئی۔"

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں خود کو پابند سمجھنے لگی ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو۔"

"کچھ بھی نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے آپ کو فون کرنا پورے دن کا اہم کام ہوتا ہے کہیں بھی جانے سے پہلے کوئی بھی پروگرام ترتیب دینے سے پہلے بے ساختہ سوچتی ہوں کہ کہیں فون کی ٹائمنگ تو ڈسٹرب نہیں ہو گی۔"

"کیوں ہوتا ہے ایسا؟" سرمد نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

"شاید اس لئے کہ آپ انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کے انتظار میں جتنی شدت ہوتی ہے اس حساب سے میری بے چینی بڑھتی رہتی ہے۔"

اگلے چند دن سرمد نے سخت بے قراری کے عالم میں گزارے اسے معلوم تھا کہ شبانہ کا فون نہیں آئے گا پھر بھی بارہ بجتے ہی اس کی نگاہیں گاہے گاہے فون سیٹ کی طرف اٹھنے لگتیں تھی...... ہاں.......... وہ واقع عادی ہو چکا تھا اب یوں لگتا تھا کہ عادت عادت نہیں رہی بلکہ کچھ اور بن گئی ہے۔

یہ غالبا پانچویں روز کی بات تھی شام کو سرمد تسلیم اور کاشف کے ساتھ کیرم کھیلنے میں مصروف تھا۔ کھیلنے کے ساتھ ساتھ تسلیم ننھے ریحان کو دودھ بھی پلا رہی تھی...... اس نے ریحان کو چادر میں چھپایا ہوا تھا اور غیر محسوس طور پر ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ عورت کا وہی انداز جو اسے سب سے خوبصورت روپ عطا کرتا ہے چہرے پر ممتا برستی ہوئی آنکھوں میں سرور سا۔

اچانک وہ چونک گئی۔ کچن میں ہانڈی کے نیچے آنچ کچھ تیز تھی۔ اس

کے حساس اور مشاق نتھنوں نے مرچ کے جلنے کی بو بڑے ابتدائی مرحلے میں محسوس کرلی تھی۔ اس نے ریحان کو ایک جھٹکے کے ساتھ خود سے جدا کیا۔ اور قالین پر لٹا دیا۔ وہ اس اچانک بے دخلی پر جھنجھلایا ہوا نظر آیا۔ گلاب ہونٹوں پر ابھی تک ''سعید ممتا'' کے قطرے تھے۔ تسلیم ہانڈی سے الجھنے کے لئے کچن کیطرف دوڑ چکی تھی.... سرمد نے منہ بسورتے ریحان کا سر اپنے زانو پر رکھا اور تھپکنے لگا۔ یہی وقت تھا کہ جب شبانہ کی کال آگئی۔ سرمد نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور ''ہیلو'' کہا دوسری طرف خاموشی رہی۔ بس باتوں اور قہقہوں کا ہلکا شور سنائی دے رہا تھا۔

سرمد نے جب تیسری بار ہیلو کہا تو دوسری طرف سے شبانہ کی شوخی اور لگاوٹ میں گندھی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہیلو۔ کیسے ہیں آپ۔''

سرمد نے چونک کر کچن کیطرف دیکھا دروازہ بند تھا اور تسلیم نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ دبے لہجے میں بولا ''بس ٹھیک ہوں۔ تم نے اس وقت کیسے فون کرلیا۔''

''بس دل چاہا اور کرلیا......... باجی تسلیم کدھر ہیں؟''

''زیادہ دور نہیں ہیں... بب......... بلاؤں انہیں؟''

''چلو خود ہی آجائیں گی اتنی دیر میں ہم بات کر لیتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں جانی پہچانی معنویت تھی۔

''لیکن اس وقت؟''

''وقت تو سارے ایک جیسے ہوتے ہیں بس دل کی موسم کی بات ہوتی ہے جناب۔''

''تمہارے دل کا موسم میرے گھر کے موسم سے میل نہیں کھا رہا ....میرا مطلب ہے کہ تسلیم چند منٹ کیلئے کچن میں گئی ہے۔''

''چند منٹ بھی بہت ہیں۔'' وہ ادائے بے نیازی سے بولی کبھی کبھی وہ بالکل مست ملنگ لگنے لگتی تھی۔ ہر مصلحت سے بالاتر.......... اپنی من کی موج میں بہنے والی۔

''اچھا کیا کہنا ہے؟'' وہ عاجز آجانے والے لہجے میں بولا۔

''کچھ بھی نہیں بس ایسے ہی آپ کی آواز سننے کو دل چاہ رہا تھا۔ یہاں ایک شادی کے فنکشن پر آئی ہوئی ہوں۔ خالو جان بھی ساتھ ہیں۔'' مردوں کیطرف بیٹھے ہیں۔ کرن اور ثمن خالہ زینب کے پاس ہیں میں نے یہاں فون پڑے دیکھا بس مچل گئی...... اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پوچھنے لگی'' .... کیا کر رہے ہیں آپ؟

''تمہارا کیا خیال ہے کیا کر رہا ہوں گا؟''

اس کے منہ سے ہوں کی طویل آواز نکالی، جیسے سوچ رہی ہو اور تصور کی نگاہ سے دیکھ رہی ہو'' آپ اپنی سفید شلوار اور قمیض پہنے کامن روم

میں بیٹھے ہوں گے...... اور باجی اور کاشف کے ساتھ کیرم یا لوڈو کھیل رہے ہوں گے۔؟''

''سرمد مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔'' تم دیوتا والے فرہاد علی تیمور کی رشتہ دار لگتی ہو۔''

''اچھا اب بتائیں میں کیا کر رہی ہوں۔''

''بس اتنا پتہ ہے کہ فون کر رہی ہو۔''

''یہ تو کوئی جواب نہیں۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔ پھر کہنے لگی اچھا میں خود ہی بتا دیتی ہوں۔ میں نے اس وقت وہی عنابی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی ہے جس کی تعریف آپ نے پچھلے ماہ باجی تسلیم کے سامنے ہی کی تھی۔ ساتھ ہی سرخ سینڈل ہیں۔ جو راحیل نے کویت سے بھیجے تھے۔ میں نے بال سائیڈ سے نکال کر بنا رکھے ہیں اور جوڑا بھی لگایا ہے آپ کو فون کرنے کیساتھ ساتھ میں میچنگ نیل پالش لگانے کی کوشش بھی کر

رہی ہوں............“

وہ جو کچھ بتا رہی تھی بالکل بے موقع لگ رہا تھا۔ لیکن وہ ایسی بے موقع باتیں نہ کرتی تو پھر اسے شبانہ کون کہتا؟ سرمد کو لگا کہ اس نے شاید تھوڑی دیر پہلے آئینہ دیکھا ہے۔ آئینے میں وہ خود کو خوبصورت لگی ہے۔ خوب صورت لگنے کی خوشی میں اس نے سرمد کو فون کر دیا ہے۔

”لو تسلیم آرہی ہے اس سے بات کرلو“ سرمد نے تسلیم کی چاپ سن کر فوراً اطلاع دی۔

کچھ دیر بعد تسلیم اور شبانہ گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ خواتین کی وہی باتیں جن کے آغاز کا تو پتہ ہوتا ہے انجام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ ان دونوں کی باتیں سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ ان میں سے ایک وہ نہیں ہے۔ جو نظر آتا ہے اس کے ظاہر اور باطن میں فرق ہے۔

دو دن بعد پھر وہی ریشمی رات تھی۔ وہی خواہش انگیز سناٹا تھا۔ وہی

بہکے ہوئے قدم تھے بظاہر ان کے درمیان کئی میل کا فاصلہ تھا لیکن سوچ کی نگری میں وہ پاس پاس لیٹے تھے اور سرگوشیاں کر رہے تھے۔

”سرمد ہم جو کچھ کر رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے ناں۔“

”پتا نہیں۔ سرمد منمنایا۔

”باجی تسلیم کیا سوچیں گی۔ کسی اور کو پتہ چلے گا تو کیا کہے گا۔

”یہ سب کچھ بہت غلط ہے ناں سرمد؟“

وہ خاموش رہا۔ جسم کی تپش اور اس تپش سے پیدا ہونے والا ابال کم ہونے لگا۔

وہ بولی ”کتنا اچھا ہوتا ہم پہلے ملے ہوتے۔ کتنا اچھا ہوتا۔“

”پہلے ملے ہوتے تو کیا ہوتا؟“

”میں آپ کو بتا دیتی کہ پیار کیسے کیا جاتا ہے۔“ وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔

''اب کیا ہو سکتا ہے۔'' سرمد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

شاید اس نے سرمد کے لہجے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ناراضگی اور اداسی محسوس کر لی تھی۔ فوراً اپنے چنچل اور گدگداتے انداز پر لوٹ آئی۔

''اچھا میں ایک گیت سناتی ہوں۔'' اس نے پہلی بار سرمد کی فرمائش کے بغیر ہی آمادگی ظاہر کر دی۔ ''بتائیں۔ کون سا سناؤں۔'' وہ کسی ٹین ایجر کی طرح اٹھلا کر بولی۔

''جو تمہارا دل چاہے۔'' سرمد نے کہا۔

وہ میڈونا کا ایک معروف گیت گانے لگی۔ گاتے ہوئے وہ اپنی آواز بہت باریک کر لیتی تھی۔ ایسا کر کے وہ بلند ترین سروں میں بھی بہت آسانی سے پہنچ جاتی تھی۔ گیت ختم کرنے کے بعد وہ حسب عادت تھوڑا سا ہنسی اور ہمیشہ کی طرح پوچھا ''کیسا ہے؟''

''بہت خوب۔'' سرمد نے کہا۔

وہ ایک بار پھر اس تخیل میں کھو گئے جو ٹیلی فون کے تار کے ذریعے انہیں ایک دوسرے کے بالکل قریب لے آتا تھا۔ ایک ہی بستر پر ....ان کے درمیان چند انچ کی دوری باقی رہ جاتی تھی۔ یہ دوری بھی بتدریج کم ہو رہی تھی۔

یہ عجیب کھیل تھا۔ مجنونانہ لیکن پر لطف۔

"میرے قریب ہونا؟ سرمد نے پوچھا۔

"ہاں...... بہت قریب۔" وہ خواب ناک سرگوشی میں بولی۔

"تمہارا منہ ماؤتھ پیس کے قریب ہے نا؟"

"ہوں۔"

"میرا بھی قریب ہے۔" دوسری طرف بس سانس سنائی دیتی رہی۔

"تمہارا ہاتھ تھام لوں۔"

"تھام لیں۔"

"کون سا؟" سرمد نے پوچھا۔"

سلگتی ہوئی مدھم ہنسی سنائی دی۔ "دایاں۔"

"تھام لیا۔" سرمد نے کہا۔

اور اسے واقعی لگا کہ اس نے شبانہ کا نرم گرم ہاتھ تھام لیا۔ وہ ہاتھ جس کے پیچھے مرمریں بازو ہے اور جس کے پیچھے ایک تنا ہوا جسم ہے۔ وہ جسم جس پر سج کر ہر لباس خوبصورت ہو جاتا ہے اور اگر وہ ساڑھی ہو تو پھر اس کی خوبصورتی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔

اچانک کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ سرمد نے جیسے بجلی کے ننگے تار چھو لیا تھا۔ وہ اچھل کر بیٹھ گیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ اس نے کب ریسیور نیچے رکھا۔ اور کب اپنی لرزتی ٹانگوں پر کھڑا ہوا۔ دروازہ ایک بار پھر زور سے دھڑ دھڑایا۔ اس کی آواز سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسکے عقب میں کھڑا موجود فرد غصے میں پھنک رہا ہے۔ غالباً یہ فرد تسلیم

بی تھی۔ پھر اس کی تصدیق بھی ہوگئی وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولی۔

دروازہ کھولیں سرمد.............دروازہ کھولیں۔''

وہ لباس درست کرتے ہوئے دروازے تک پہنچا اور چٹخنی گرادی۔

تسلیم اس کے سامنے تھی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے اشک اور انگارے ایک ساتھ برس رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''کیا کر رہے تھے آپ.........کس سے باتیں کر رہے تھے؟''

اس نے سوال کیا۔ اور ''اپنے مرد'' سے اس سوال کا ''حق'' عورت خود روز اول سے رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جہاں اور جس زمانے میں بھی وہ اس نوح کا سوال کرتی ہے اس کی آواز میں ایک خداداد طاقت اور کڑک آجاتی ہے۔

''سرمد'' ''صم بکم'' کھڑا تھا اس کے جبڑے مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے تسلیم نے اپنے ہاتھوں سے اس کے دونوں شانے تھام لئے اور

اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی'' آپ بتاتے کیوں نہیں ......یہ کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں.........میں اندھی اور بہری نہیں ہوں مجھے بتائیں۔ یہ کس سے باتیں کر رہے تھے آپ۔''

''وہ........دوست تھا ایک۔''

''جھوٹ مت بولیں............مت بولیں جھوٹ۔'' وہ چیخ کر بولی۔ پھر وہ دیوار سے ماتھا ٹیک کر بلند آواز میں رونے لگی۔ روتے روتے ہی اس نے ایک دم تر بتر چہرہ اٹھایا اور گرجی ''میں سب جانتی ہوں۔ یہ وہی حرامزادی کتیا ہے۔ جو دن رات آپ کو چمٹی ہوئی ہے۔ فون کرتی ہے تحفے بھیجتی ہے۔ بہانے بہانے سے گھر کے چکر لگاتی ہے کبھی اس کی بچی بیمار ہو جاتی ہے کبھی اس کا بندہ کویت میں گم ہو جاتا ہے۔ کبھی اسے بینک میں کام پڑ جاتا ہے۔ آپ پاکستان میں سب سے بڑے مصور ہیں اور وہ پاکستان میں سب سے زیادہ آپ کی

تصویروں کو سمجھنے والی۔ وہ ڈائن ہے۔ اس نے میرا گھر اجاڑ دیا
.... میری زندگی برباد کر دی.........'' وہ ایک سانس میں بولتے
چلی گئی اور پھر نڈھال ہو کر صوفے پر گر گئی۔

''میری بات سنو تسلیم۔'' سرمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

تسلیم نے ایک مشتعل جھٹکے سے اس کا ہاتھ پیچھے کیا اور تیز قدموں سے
بیڈ روم کی طرف لپک گئی۔

وہ رات بھر روتی رہی اور سرمد اس کے پہلو میں گم صم لیٹا رہا۔ اس نے
تسلیم سے کچھ بھی کہنے کی کوشش نہیں کی۔ سرمد کو معلوم تھا کہ اس وقت
کچھ بھی کہنا سننا بے کار ہے وہ رہ رہ کر سوچنے لگتا تھا کہ تسلیم نے اس
کی چوری کیسے پکڑ لی؟ بیڈ روم اسٹڈی کے درمیان پینتالیس فٹ کی
دوری پر تھا۔ درمیان میں ایک کوریڈور تھا اور دو دروازے تھے۔ فون
پر کی جانے والی سرگوشیوں کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یوں

لگ رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے سرمد کی کھوج میں تھی......... سرمد کو
چند دن پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ اور وہ تجزیہ کرنے لگا کہ تسلیم کے
رویے میں کہاں کہاں شک کی پرچھائیاں نظر آتی رہی ہیں.........

علی الصبح سرمد گھر کی بالائی منزل پر گیا۔ اسے ایک شک سا ہوا تھا۔ کچھ
عرصہ پہلے فون کی ایک ایکسٹینشن بالائی منزل پر رکھی گئی تھی لیکن بعد
میں یہ فون ختم کر دیا تھا۔ ایکس ٹینشن کا تار غالباً وہیں کہیں موجود تھا۔

سرمد نے ڈھونڈا اور تار ایک صوفے کے عقب سے مل گیا۔ تار کے
سرے تازہ تازہ چھلے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ تار کو حال ہی میں
استعمال کیا گیا ہے۔ اب ساری بات سرمد کی سمجھ میں آنے لگی۔ تسلیم
نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس متروک تار کے ذریعے
شبانہ کے ساتھ اس کی گفتگو سنی تھی اور اپنے شکوک کو ٹھوس حقیقت میں
بدلا تھا۔ احساس ندامت سے اس کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔

اسے وہ سب کچھ یاد آیا جو کل شب اس نے شبانہ سے اور شبانہ نے اس سے کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تسلیم کے لئے ایک طرح کا غصہ بھی اس کے اندر نمودار ہوا۔ اس نے سرمد پر کڑی نظر رکھی تھی اور ایک چوکس بیوی کی حیثیت سے اسے کسی طرح کی رعایت نہیں دی تھی۔

سرمد کو یاد آیا کہ کل وہ کس طرح دیوانہ وار دروازہ پیٹنے لگی اور رو سے آوازیں دینے لگی تھی۔ سرمد نے فوراً فون منقطع کر دیا تھا لیکن اس امر کا امکان موجود تھا کہ اس ہلچل کی بازگشت شبانہ کے کان تک بھی پہنچ گئی ہو۔

شبانہ کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگا اور پریشان ہونے لگا۔ پھر اس کے دل میں ایک نیا اندیشہ جاگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھڑکی ہوئی تسلیم شبانہ سے جا کر الجھ جائے........ یا پھر انکل عثمانی کو ہی الٹا سیدھا فون کر دے۔

تسلیم نے ناشتہ نہیں کیا۔ اسکی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئیں تھیں تاہم سرمد کا ناشتہ اس نے ٹیبل پر رکھ دیا۔ سرمد نے بھی ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سارے گھر پر ایک سوگواری سی طاری تھی۔ بچے بھی نہ جانے کیوں سہمے سے نظر آتے تھے کاشی کو اسکول لے جاتے سے پہلے سرمد کمرے میں گیا۔ تسلیم صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھی تھی۔ سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ یقیناً وہ آنسو بہا رہی تھی۔

سرمد چند سیکنڈ خاموش کھڑا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا" جو کچھ ہوا ہے اسے گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہنا چاہئے........ کسی طرح کا تماشا نہ لگا لینا اب۔"

آواز میں ندامت کم اور ناراضگی زیادہ تھی۔

تسلیم اسی طرح بیٹھی رہی اس کے جسم میں جنبش تک نہیں ہوئی۔ چہرہ گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا۔ شلوار کے گلابی پائنچوں کے نیچے سفید پاؤں

تنگے تھے وہ بالکل سمٹی ہوئی اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی تھی۔

سرمد نے چند سیکنڈ انتظار کیا کہ شاید وہ کچھ کہے۔ تب دروازے سے باہر نکلتے نکلتے اس نے ایک بار پھر تحکمانہ انداز میں کہا "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

اگلے آٹھ دس روز تک حالات جوں کے توں رہے۔ نہ تسلیم نے سرمد سے کچھ کہا اور نہ سرمد نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ان دونوں کی بول چال بند تھی۔

کوئی نہایت ضروری بات کرنا ہوتی تو وہ مختصر ترین الفاظ میں کرتے تھے۔ تسلیم تو کسی وقت یہ مختصر ترین الفاظ بھی استعمال نہیں کرتی تھی وہ اپنی بات ریحان کے ذریعے سرمد تک پہنچاتی تھی۔ بہر حال سرمد

محسوس کر رہا تھا کہ حالات میں بتدریج کسی نہ کسی طرح سے بہتری پیدا ہو رہی ہے۔

اس دن کے بعد سے شبانہ کے ساتھ بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سرمد نے فون کرنے کی کوشش کی تھی نہ شبانہ نے فون کیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس دن شبانہ نے دروازہ "دھڑ دھڑانے" اور تسلیم کے پکارنے کی آواز سن لی تھی.......اور دور بیٹھ کر ہی حالات کا اندازہ کر لیا تھا اب وہ یکسر دم سادھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

یوں یوں دن گزرتے گئے اس واقعے کی شدت کم ہوتی گئی۔ تسلیم کے حوالے سے سرمد کا ڈر کچھ کم ہو گیا۔ شبانہ کا خیال ایک بار پھر دل و دماغ میں سرسرانے لگا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور اس کے احساسات کس نوعیت کے ہیں۔ یہ بات تو طے تھی کہ اب وہ اتنی آسانی سے ایک دوسرے کو

بھول نہیں سکیں گے۔انہوں نے قصداً ایسا ہوا ایک راستے پر سفر کیا تھا
اس پر آگے بڑھے تھے۔راستے کی گرد کے ذرے اسکے دل و دماغ
سے چپٹے ہوئے تھے۔وہ اتنی آسانی سے علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے۔
ایک دن اچانک شبانہ کا فون آگیا۔وہ شاپ پر تھا۔کوئی گاہک بھی
نہیں تھا وہ شیشے کے بند کمرے میں وسیع میز کے سامنے بیٹھا تھا۔
شبانہ کی دبی دبی آواز سرمد کے کانوں میں گونجی اور اس کے پژمردہ
رگ و پے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔
"شبانہ نے اداسی آواز میں کہا۔" کیسے ہیں آپ۔"
"یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہ رہا ہوں پچھلے دس بارہ روز سے۔
سرمد نے کہا۔"
"اس رات کیا ہوا تھا؟" دروازہ بجنے کی آوازیں آئیں تھیں اور
ساتھ ہی باجی بھی بہت زور سے بول رہی تھیں۔"

"بس۔وہ پریشان تھی کہ میں اتنی رات گئے تک اسٹڈی میں گھس کر
بیٹھا رہتا ہوں۔اس رات اس کی طبیعت کچھ خراب تھی بس اس لیئے
تیخ پا ہو گئی۔"
"مجھے لگتا ہے کہ آپ چھپا رہے ہیں.........انہیں کسی طرح پتا چل
گیا ہے کہ ہم فون پر ساری ساری رات بات کرتے رہتے ہیں۔"
"نہیں ایسی بات نہیں ہے، شبانہ، ہاں تم یہ کہہ سکتی ہو کہ وہ شک میں پڑ
گئی ہے۔"
"میرا دل نہیں مان رہا سرمد۔" شبانہ نے تفکر آمیز اداسی سے کہا۔پھر
ذرا توقف سے بولی۔ادھر بھی حالات گڑبڑ ہیں۔خالو ایک دم گم سم
اور خفا نظر آتے ہیں۔انہوں نے فون بھی کوریڈور میں رکھوا دیا ہے۔
مجھے تو ایک اور شک ہو رہا ہے۔" وہ پراندیش آواز میں بولی۔
"کیسا شک؟"

''کہیں......ایسا تو نہیں کہ باجی تسلیم نے ہی خالو جان سے کچھ کہہ دیا ہو۔ وہ اکثر فون پر ان سے بات کر لیتی ہیں۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے..........سرمد یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ میں نے تسلیم کو اس حوالے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

''کچھ بھی ہے سرمد......میں بہت پریشان ہوں۔ میری وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ باجی کیا سوچتی ہوں گی میرے بارے میں......اور اگر......راحیل کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا........وہ تو پہلے ہی۔''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کچھ نہیں ہوگا شبانہ ! حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آپ مرد ہیں اس لئے یہ بات کہہ سکتے ہیں۔ ایک عورت کی مجبوریوں کا آپ کو کیا پتہ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں خالو جان راحیل کے کانوں میں کچھ نہ کچھ پھونک نہ دیں۔ وہ یہاں کی ذرا

ذرا سی بات کویت میں اس تک پہنچاتے ہیں۔ ہر دوسرے روز ٹیلی فون پر لگے بیٹھے ہوتے ہیں۔ عجیب سی ٹینشن پیدا کر رکھی ہے انہوں نے۔''

''شبانہ خود کو دور دراز کے اندیشوں میں مبتلا نہ کرو۔ انکل عثمانی کے چپ ہونیکی کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس طرح تسلیم کے سلسلے میں بھی تمہارے اندیشے سب کے سب ٹھیک نہیں ہیں۔''

''کچھ نہ کچھ تو ہے سرمد........اور جتنا کچھ بھی ہے اس کی مجرم میں ہوں۔''

''تمہاری یہ بات بھی غلط ہے اگر کسی معاملے میں ہم قصوروار ہیں تو پھر دونوں ہیں۔ تم خواہ مخواہ اپنے دل پر بوجھ مت لو۔''

''وہ چپ رہی۔ شاید آنسو بہا رہی تھی۔ سرمد نے پوچھا۔

''اب کب فون کرو گی؟''

سرمد کا خیال تھا کہ شاید وہ کوئی حوصلہ شکن جواب دے گی۔ کہے گی کہ اب یہ سلسلہ ختم کر دینا چاہئے یا اس قسم کی کوئی اور بات لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی'' گھر پر فون نہیں کروں گی۔ جمعہ کے دن ٹھیک اسی وقت شاپ پر کال کیا کروں گی......''

''یعنی پورے ایک ہفتے بعد۔ سرمد نے کہا''

''ہاں سرمد، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ خالو جان بری طرح چونکے ہوئے ہیں۔ مجھ پر کڑی نظر رکھ رہے ہیں۔ کہیں آتے جاتے بھی نہیں۔ صرف جمعہ کے دن مجبوراً نکلتے ہیں انہیں ہسپتال جانا ہوتا ہے چیک اپ کروانے کیلئے۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ اس سے بات کرتے کرتے سرمد کو کبھی کبھار لگتا تھا کہ وہ ایک گھریلو خاتون سے

نہیں کسی فرسٹ ائیر کی لڑکی سے بات کر رہا ہے۔ عجیب سا والہانہ پن اور منہ زور جذبہ جھلکنے لگتا تھا اس کی گفتگو سے وہ ایک تند بہاؤ کی طرح لگتی تھی۔ اچھلتی کودتی سرکش۔ اپنے ساتھ ہر شے کو بہا لے جانا چاہتی تھی۔

وہ اپنی بچیوں سے اپنے گھر سے محبت کرتی تھی لیکن وہ جس راہ پر چل رہی تھی وہ گھروں کو ختم کر دیتی ہے وہ تسلیم سے دوستی کا دم بھرتی تھی اس کو تحائف دیتی تھی اور ہر طرح سے محبت کا اظہار کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے شوہر پر بھی نظر رکھے ہوئے تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ وہ حالات کے رخ سے ڈر گئی ہے اور ان حالات کی بیشتر ذمے داری خود اس پر عائد ہوتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جمعے کے جمعے فون کرنے کا بھی وعدہ کرتی تھی۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی یہ رومانوی سلسلہ یہیں ختم نہیں

ہو گا۔

شبانہ کا تجزیہ کرنے کے بعد سرمد خود اپنے آپ کو ملامت کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اس معاملے میں خود بھی بری الذمہ نہیں تھا۔ بے شک شبانہ نے اہم کردار ادا کیا تھا لیکن ثانوی کردار اس کا بھی تھا۔

☆☆☆☆

ان دونوں کے درمیان فون کا سلسلہ ایک بار پھر سے شروع ہو گیا۔ وہ اسے پی سی او سے فون کرتی تھی۔ اس کا فون شاپ پر آتا تھا۔ جمعے کے دن ٹھیک بارہ بجے سرمد پہلے سے ایسا اہتمام کر لیتا تھا کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ ان کے درمیان قریباً آدھا گھنٹہ بات ہوتی۔ اب وہ کھل کر ایک دوسرے سے رومانوی گفتگو کرتے تھے۔ فون کے انتظار میں جو گھڑیاں گزرتی تھیں۔ اس کی کربناکی بیان ہوتی تھی۔ اداس راتوں کا قصہ ڈسکس ہوتا تھا۔ دوریوں اور مجبوریوں کا ماجرا

بیان کیا جاتا تھا۔ اب ان کی جھجک دور ہو چکی تھی وہ ایک دوسرے کو اسی طرح مخاطب کرتے جس طرح دو پیار کرنے والے کرتے ہیں وہ اپنے اس تعلق کو بالکل غلط سمجھتے تھے لیکن پھر بھی اسے برقرار رکھے ہوئے تھے۔

شبانہ کے ذہن میں یہ بات جیسے بیٹھ چکی تھی کہ تسلیم کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور اس نے یہ سب کچھ خالو عثمانی کے گوش گزار بھی کر دیا ہے۔ شبانہ کو اس بات کا بھی رنج تھا کہ خالو عثمانی نے کویت میں راحیل سے رابطہ کیا ہے اور اس کے کانوں میں نہ جانے کیا بھر دیا ہے کہ راحیل کا لب ولہجہ یکسر بدلا ہوا ہے۔ وہ بہت کم فون کرتا ہے اور اگر کرتا بھی ہے تو رکھائی سے دو چار باتیں کر کے اور بچیوں کے بارے میں پوچھ کر بند کر دیتا ہے۔

سرمد نے محسوس کیا کہ شبانہ اپنے راز کے افشاء ہونے کی ذمہ داری

لاشعوری طور پر تسلیم پر ڈال رہی ہے۔ اس کے ذہن کی گہرائی میں
کہیں یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ تسلیم نے ایک کایاں بیوی کا کردار
ادا کرتے ہوئے اپنے شوہر پر پوری طرح نگاہ رکھی ہے اور اس کی
"رومانی غلطی" کو ابتداء میں ہی پکڑ کر بے رحمی سے احتساب کیا ہے
ایسے کرتے ہوئے اس نے یہ بھی نہیں سوچا اس کے شوہر کیلئے یا شبانہ
کیلئے کوئی بڑی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔

اس پہلو سے جب سرمد بھی سوچتا تھا تو اس کے دل میں تسلیم کے لئے
گھٹن سی پیدا ہو جاتی تھی، بیویاں شوہروں کی کوتاہیوں سے چشم پوشی
کرتے ہوئے اکثر "بڑے ظرف" کا مظاہرہ کرتی ہیں اور اگر ایسا نہ
بھی کر سکیں تو کم از کم شوہروں کو ایک دو موقع تو ضرور دیتی ہیں لیکن
تسلیم نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اگر شبانہ کا اندازہ درست تھا (اور سرمد کا
خیال کہ درست ہی ہے) اور تسلیم نے "حقیقت حال" خالو عثمانی سے

بیان کی تھی تو پھر واقع اس نے سخت دلی کا ثبوت دیا تھا۔

ایک جمعے کو شبانہ کا فون آیا تو وہ قدرے خوشگوار موڈ میں تھی۔ کہنے لگی

"شام کو کیا کر رہے ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"ڈیفنس کا بلیو سٹار ریسٹوران دیکھا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ ایک دو مرتبہ دوستوں کے ساتھ گیا ہوں۔ اسٹینڈرڈ کی جگہ
ہے۔"

"ریسٹوران والوں نے آپ کی ایک پینٹنگ لگائی ہے۔ ڈائننگ ہال
میں وہی شاہ عالمی دروازے والی............"

پینٹنگ تو خوب صورت تھی لیکن انہوں نے جس طرح لگائی ہے وہ
اہتمام بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ شاید اسی کو سونے پر سہاگہ کہتے
ہیں۔"

''پھر تو دیکھنا چاہئے۔''

''چلئے، میں بھی آ جاؤں گی۔ کتنے بجے جائیں گے آپ؟''

سرمد کے سینے میں جلترنگ سے بج اٹھے۔ ساڑھی میں کسا ہوا ایک پارہ صفت بدن یاد آیا ''تم کتنے بجے آ سکتی ہو۔''

اس نے بند ہونٹوں سے ''ہوں'' کی طویل آواز نکالی اور پھر بولی۔ خالو اور خالہ کو سات بجے ایک شادی پر جانا ہے۔ ملازمہ رضوانہ گھر پر ہو گی۔ کرن اور ثمن اس کے پاس رہیں گی۔ میں آٹھ بجے تک پہنچ جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے میں بھی آ جاؤں گا۔''

''او کے'' اس نے کہا اور ہنس کر فون بند کر دیا۔

''اس کے لہجے میں ایک تپش اور ایک سرکشی سی محسوس ہوتی تھی۔ یہ سرکشی کس کے خلاف تھی شاید انکل عثمانی کے خلاف۔ شاید تسلیم کے

خلاف......... یا پھر ان سب کے خلاف۔

رات ساڑھے آٹھ بجے وہ ریسٹوران کے ایک فیملی کیبن میں بیٹھے تھے بدن نے ساڑھی کو اور ساڑھی نے بدن کو مثالی بنا دیا تھا۔ انہوں نے شاہ عالمی دروازے کی پینٹنگ بھی دیکھی لیکن پینٹنگ سے زیادہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ آج نگاہوں میں بے باکی تھی اور خواہش آمیز چمک رخساروں پر لشکارے مارتی تھی کھانے کے بعد وہ وسیع پارکنگ لاٹ میں آ گئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سرمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ کے پیچھے بازو تھا اور بازو کے پیچھے گداز جسم.........اور جسم میں حرارت تھی۔ اور اس جسم میں سب سے زیادہ حرارت والے ہونٹ تھے۔ آج درمیان میں فون نہیں تھا آج وہ واقعی ایک دوسرے کے قریب تھے۔ سانسیں الجھ رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے۔ دو تین منٹ اسی طرح گزرے۔

انکے عین سامنے پارک کی جانے والی گاڑی کا ڈرائیور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا تو وہ ایک دوسرے سے پیچھے ہٹ گئے۔ شبانہ اپنے منتشر بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی ''آپ کو معلوم ہے پرسوں باجی تسلیم نے پھر خالو کو فون کیا تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے اسے باتیں کرتے سنا ہے۔ خالو باجی تسلیم کا نام لے کر کہہ رہے تھے تم بے فکر رہو۔''

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کا مجھے آج صبح پتہ چلا ہے۔''

''پلیز شبانہ پہلیاں نہ بجھواؤ۔''

''بھائی تنویر نے بتایا کہ راحیل کویت سے واپس آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عید الفطر سے پہلے ہی لوٹ آئیں...... اور مجھے یقین ہے کہ

خالو عثمانی نے انہیں باجی تسلیم کی باتوں سے متاثر ہو کر بلایا ہے۔ باجی تسلیم ہمیں معاف کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔''

شبانہ کی لہجے میں ہلکی سی تپش تھی۔ سرمد کو لگا کہ آج ان دونوں میں جو ''ملاقات'' ہوئی ہے وہ دراصل تسلیم کی کارگزاری کا جواب ہے۔ کبھی کبھی تو خود سرمد بھی اس طرح کی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ تسلیم کی ہردم نگران آنکھوں سے جھنجھلا کر اس کا دل سرکشی کو چاہنے لگتا تھا۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پھر اسٹڈی میں وقت گزارنا شروع کر دے۔ اور تسلیم کی نگران نگاہوں کی نظر انداز کر کے شبانہ کو فون کیا کرے۔

''چند روز پہلے ایک رات اس نے ایسا کیا بھی تھا۔ پینٹنگ کے دوران میں وہ رات تیسرے پہر تک جاگتا رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ تسلیم سو جائے اور وہ شبانہ سے مختصر ہیلو.......... ہیلو کرے لیکن رات تین بجے تک انتظار کرنے کے باوجود موقع نہیں مل سکا۔ تسلیم اس کے

ساتھ مسلسل جاگتی رہی۔ اس نے اسٹڈی اور بیڈروم کے دونوں دروازے بھی کھلے رکھ چھوڑے تھے۔

تین چار ہفتے مزید گزر گئے۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑی کے اندر ہونے والی مختصر ملاقات کے بعد انہیں پھر کوئی ایسا موقع نہیں مل سکا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ انہیں ایک دوسرے سے ٹیلی فونک رابطے کا طریقہ ضرور ڈھونڈ نکالا۔ ان دنوں موبائل فون نئے نئے شروع ہوئے تھے۔ شبانہ نے موبائل کنکشن لے لیا۔ چند دن بعد سرمد نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ گاہے بگاہے پھر ایک دوسرے سے بات چیت کرنے لگے۔ عیدالفطر سے دس پندرہ روز پہلے ہی راحیل کویت سے واپس آ گیا۔ راحیل کے واپس آنے کے بعد فوراً حالات نے وہی رخ اختیار کر لیا جس کا سرمد اور شبانہ کو اندیشہ تھا۔ راحیل کچھ کھچا کھچا نظر آیا۔ عثمانی صاحب اور باقی گھر والے تو پہلے ہی کھچے ہوئے تھے۔ دونوں گھرانوں میں

دوری کے آثار نمودار ہونے لگے عید کے موقع پر بھی ان کے درمیان رسمی سی ملاقات ہی ہوئی۔

راحیل کے پاکستان آنے کے بعد صرف ایک دفعہ شبانہ کا فون آیا تھا۔ اس نے شاپ سے ٹیلی فون کر کے بتایا تھا کہ کچھ عرصے کے لئے ان کے ان کی ٹیلی فونک بات چیت ممکن نہیں ہے۔ اس نے مبہم سا اشارہ دیا کہ شاید اب راحیل پانچ چھ ماہ تک کویت واپس نہیں جائیں گے۔

دن گزرتے رہے اور اس دوران دونوں گھروں کے تعلقات بھی سرد مہری کا شکار ہوتے رہے۔ سرمد کو تسلیم سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اپنی ازدواجی زندگی بچانے کے لئے کیا تھا۔ ممکن تھا سرمد اور شبانہ کے تعلق کا کھوج لگانے کے بعد واقعی اس نے انکل عثمانی سے بات کی ہو۔ اور انہیں شبانہ کے حوالے سے چوکس کیا ہو...... لیکن

اگر اس نے ایسا کیا بھی تھا تو یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ راحیل کی واپسی کے تین چار ماہ بعد ایک دفعہ پھر شبانہ کا فون آیا۔ وہ کافی بجھی بجھی تھی اس نے بتایا کہ راحیل ملازمت چھوڑنے اور مستقل طور پر پاکستان میں رہنے کا پروگرام بنا رہے ہیں......... وہ کچھ بیمار بھی لگ رہی تھی۔ اس کے لب و لہجے میں افسردگی اور جدائی کی کسک تھی۔ بہرطور اس نے واضح الفاظ میں ارادہ ظاہر کیا کہ وہ سرمد سے اپنا ناطہ یکسر توڑ نہیں دے گی۔ ان کی دوستی برقرار رہے گی۔ اور کبھی کبھی اسے فون ضرور کیا کرے گی۔

آنے والے دنوں میں سرمد اور شبانہ کے تعلق پر مزید اوس پڑی۔ راحیل نے واقعی مستقل طور پر پاکستان میں رہنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ شبانہ کے بارے میں یہ اڑتی اڑتی خبر ان کے کانوں تک پہنچی کہ اس کا پاؤں بھاری ہے۔

شبانہ کے لہجے میں جو نقاہت سرمد نے ٹیلی فون میں محسوس کی تھی اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی۔

پھر ایک روز یہ اطلاع میرے کانوں تک پہنچی کہ راحیل ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔ اس موقع پر سرمد کے گھر سے صرف سرمد کی والدہ عثمانی صاحب کے ہاں گئی تھیں اور رسمی مبارکباد دے کر واپس آ گئی تھیں۔ والدہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ راحیل اور تنویر دونوں بھائی مل کر اپنا کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کیلئے انہوں نے ملتان میں ایک بڑا شوروم کرائے پر حاصل کیا ہے۔

سرمد کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اب شبانہ والا معاملہ مستقل خاتمے کی طرف جا رہا ہے اور شاید ایک طرح سے یہ بہتر ہی تھا۔ جس سفر کو انجام تک پہنچانا ممکن نہ ہو اور جس کے جاری رہنے میں بدنامی اور جگ ہنسائی کے بدترین اندیشے موجود ہوں۔ اس کا ختم ہونا ہی بہتر

ہے۔اپنی فون کالوں میں کبھی کبھی شبانہ بھی یہ بات کہا کرتی تھی۔
خاص طور پر آخری دنوں کی فون کالز میں وہ کہا کرتی تھی.........''سرمد
!یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ ہمارے اس سفر کا انجام کیا ہوگا۔ہم
دور نکلتے جارہے ہیں۔''

تسلیم شبانہ کا ذکر بہت کم کیا کرتی تھی بلکہ کسی وقت تو سرمد کو یوں محسوس
ہوتا تھا کہ وہ سرمد کے سامنے اس کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتی۔سرمد
نے بھی کبھی تسلیم کے سامنے شبانہ کا نام نہیں لیا۔اسے عجیب سی جھجک
محسوس ہوتی تھی۔تاہم ایک روز تسلیم نے کافی عرصے بعد شبانہ کا نام
لیا اور بولی'' بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ بیمار رہتی ہے سنا ہے گردوں
میں کچھ تکلیف ہے۔امی بتا رہی تھیں کہ کافی کمزور ہوگئی ہے......''

''سرمد سر ہلا کر رہ گیا۔اس نے سوچا کہ شاید تسلیم کہے کہ ایک بار عثمانی
صاحب کے گھر جا کر شبانہ کی عیادت کر لینی چاہیے۔لیکن اسکی یہ توقع

پوری نہیں ہوئی۔تسلیم نے شبانہ کے حوالے سے دوسری خبر سناتے
ہوئے کہا''امی نے بتایا ہے کہ وہ لوگ پرسوں ملتان شفٹ ہوگئے
ہیں۔اگر پہلے پتہ چل جاتا تو اسی کی مزاج پرسی کر آتے۔''

روز و شب کی اڑائی ہوئی گرد میں اہم ترین یادوں بھی دھندلانا شروع
ہو جاتی ہیں۔کم از کم ان میں وہ پہلے والی آب و تاب باقی نہیں رہتی۔
وقت تیزی سے گزرتا رہا سرمد کاروباری اور مصوری جیسی دو متضاد
مصروفیات کو ساتھ ساتھ چلاتا رہا۔گاہے بگاہے اس کے برش سے
کوئی یادگار پینٹنگ بھی تخلیق پا جاتی۔اس پینٹنگ کی تعریفیں ہوتیں تو
سرمد کا دھیان آپوں آپ ہی شبانہ کی طرف چلا جاتا۔پتہ نہیں وہ کیا
کر رہی تھی، کہاں تھی؟ شاید وہ اب بھی سرمد کی تصویریں دیکھتی ہوگی۔
ان پر غور کرتی ہوگی۔پھر سرمد کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا۔شاید کسی
دن کسی تصویر کے حوالے سے اچانک اس کا فون آجائے۔

ان لوگوں کو ملتان گئے پانچ چھ ماہ ہو گئے تھے۔اس دوران میں صرف ایک بار لاہور کی ایک صنعتی نمائش میں راحیل سے سرمد کی سرسری ملاقات ہوئی تھی۔اس کی زبانی اہل خانہ کا حال احوال معلوم ہوا تھا۔اور یہ بھی پتہ چلا تھا کہ شبانہ اب صحت یاب ہے اور اسے نے روزمرہ کے کام کاج شروع کر دیئے ہیں شبانہ کی تندرستی جان کی سرمد کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ شاید کسی وقت وہ فون پر رابطے کی کوشش کرے گی۔سرمد لاشعوری طور پر ایسی کسی کال کا انتظار کرنے لگا، خاص طور پر جمعے کے روز دوپہر کے وقت نہ چاہنے کے باوجود اسکے دل کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ فون کی گھنٹی بجے اور جب وہ اٹھائے تو دوسری طرف شبانہ ہو.........اسی طرح ڈیڑھ سال مزید گزر گیا۔

☆☆☆☆

وہ بہار کی ایک بڑی سہانی اور چمکدار صبح تھی۔سرمد اپنی وسیع و عریض شاپ کے بلوری آفس میں بیٹھا تھا۔فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسور اٹھایا تین چار بار ہیلو.........ہیلو کہا دوسری طرف سے یکسر خاموشی رہی۔

اس نے ریسور واپس رکھ دیا۔اتفاقاً اس طرح کی کالز آ جاتی ہیں۔ سرمد کو جب کبھی بھی کوئی ایسی کال آتی۔اس کا دھیان فوراً شبانہ کی ہی طرف گیا ان کا تعلق بظاہر ٹوٹ چکا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں سرمد کا دل کہتا تھا یہ تعلق ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹا۔ابھی فل سٹاپ نہیں لگا ابھی کچھ باقی ہے۔"

فون کی گھنٹی چند سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ بج اٹھی۔سرمد نے ریسور اٹھایا دوسری طرف شبانہ تھی۔وہ سکتے میں رہ گیا۔لرزاں لہجے میں انہوں نے ایک دوسرے کو حال احوال پوچھا۔چند فقروں کا تبادلہ

کیا۔ الفاظ ان دونوں کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر جا رہے تھے۔ وہ جیسے ایک دم ہی بہت سی باتیں کر لینا چاہتے تھے۔ پچھلے ڈھائی تین برس کی ساری باتیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اگلی رات تفصیل سے بات کرنے کے وعدے پر انہوں نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اور پھر اگلی رات آ گئی وہ ہفتے کی شب تھی۔ اتفاقاً تسلیم دونوں بچوں کے ساتھ راولپنڈی گئی ہوئی تھی........ سرمد آج پھر اسٹڈی میں تھا وہی جانا پہنچانا ماحول اور وہی جانا پہنچانا سا وقت جس میں کچھ بھولی بسری یادوں کی گونج تھی۔

حسب وعدہ رات ٹھیک بارہ بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سرمد نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا دوسری طرف شبانہ تھی۔

''شب اور شبانہ........ کتنے ہم رنگ تھے یہ دونوں لفظ...... ریشمی آواز خوابیدہ لہجہ........ پر حرارت خیالات۔ ان کی گفتگو شروع

ہوئی۔ ایک دوسرے کا تفصیلی حال احوال پوچھا گیا شباہ نے سرمد کو بتا کر حیران کر دیا کہ وہ ملتان سے نہیں کراچی سے بات کر رہی ہے۔ اس نے کہا'' راحیل نے بھائی تنویر سے اپنا کاروبار علیحدہ کر لیا ہے۔ بھائی تنویر کے مشورے سے انہوں نے یہاں کراچی میں ذاتی جگہ خریدی ہے اور کارخانہ لگانے کا سوچ رہے ہیں۔''

'' لگتا ہے کہ راحیل کیلئے خاصی خوش بخت ثابت ہوئی ہو تم۔'' سرمد نے کہا۔''

''اگر خوش بختی کا مطلب خوش حالی ہے.......... تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

'' لگتا ہے کہ شاعری کی لت ابھی چھوٹی نہیں۔''

''یہ لت نہیں ضرورت ہے........ بلکہ اب تو شدید ضرورت ہے۔''

وہ ہنسی تو سرمد کے کانوں میں بھولے بسرے جلترنگ بج اٹھے۔

''اشد ضرورت۔'' کیا مطلب؟'' سرمد نے پوچھا۔''

''میں آپ کو ہر بات کا مطلب بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔'' اس نے پھر مسکراتے لہجے میں کہا۔ سرمد نے تصور میں دیکھا کہ مسکراتے ہوئے اسکے بھرے بھرے خواہش انگیز رخسار کچھ اور بھی گداز ہو گئے ہیں۔

ان کی گفتگو سیدھے سادھے انداز میں شروع ہوئی تھی۔ بال بچوں کا حال احوال پوچھا گیا تھا۔ کام کاج کی بات ہوئی تھی گزرے ماہ سال کے اہم واقعات کا ذکر ہوا تھا۔ سرمد کی اہم تصویروں پر تبصرہ کیا گیا تھا لیکن پھر ان کا مکالمہ بتدریج وہی رنگ اختیار کرتا چلا گیا جس نے تین سال پہلے انہیں اپنے رنگ میں رنگا تھا فقرہ فقرہ لفظ بہ لفظ وہ پھر اسی پرانے لب و لہجے کی طرف سرکتے چلے گئے۔ وہ لوٹ رہی تھی۔ اور اس کے لوٹنے میں وہی تین سال پہلے والی آب و تاب جاری تھی۔

اس تیز رو دھارے میں سرمد نے دو تین بار اپنے پاؤں جمانا چاہے۔

اس نے شبانہ کو بتانا چاہا کہ اب گئے وقت کو آواز دینا درست نہیں۔ اب انہیں پھر سے اس منجدھار میں نہیں اترنا چاہئے۔ جس میں دائرے کا سفر ہوتا ہے اور انجام بھی تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا لیکن وہ رکنے والی کہاں تھی؟ وہ ہمیشہ سے ایک کوہی ندی کا بہاؤ رکھتی تھی۔ انہوں نے رات دو ڈھائی بجے تک باتیں کیں لیکن پھر ان کی گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ آ گیا۔ شبانہ نے فوراً سرگوشی کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا'' کرن جاگ گئی ہے۔ شدید کھانسی ہو رہی ہے اسے .... میں اسے دوا پلا کر آتی ہوں۔''

''میں ہولڈ کروں یا......؟''

''نہیں نہیں دس منٹ میں دوبارہ رنگ کرتی ہوں.......ذرا راحیل کو بھی دیکھ آؤں........'' وہ اتنی آسانی سے بات کر رہی تھی جیسے اتنی رات گئے شوہر اور بچوں کو دھوکہ دے کر ایک اجنبی سے باتیں کرنا قطع

غیر اہم معاملہ ہے۔

''فون بند ہو گیا تو سرمد صوفے پر سر رکھ کر سوچنے لگا........'' کیا چیز تھی یہ؟ کسی مٹی کی بنی ہوئی تھی؟ سرمد ایک جہاندیدہ زود فہم شخص تھا کسی عورت سے چند منٹ گفتگو کر کے بتا سکتا تھا کہ وہ کس کریکٹر کی مالک ہے......اس کے دل کی حتمی گواہی یہ ہی تھی کہ شبانہ برے کردار کی مالک نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر اور بچوں سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی کوئی بھی ماں کر سکتی ہے۔ راحیل کیلئے بھی اسکے دل میں عزت اور محبت موجود تھی اس کے باوجود........اس سب کے باوجود وہ ایک نہایت نامناسب تعلق بھی برقرار رکھے ہوئے تھی۔ ایسا تعلق جو عورت کے دامن پر بدنما داغ کی مانند ہوتا ہے۔

سرمد کی نگاہیں فون سیٹ پر جمی رہی اور وال کلاک کی ٹک ٹک کیساتھ شبانہ کی آواز کا انتظار پھر سے عود کر آنے والی بیماری کی طرح سرمد کے

دماغ میں چبھتا رہا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ پھر فون پر چہک رہی تھی۔ دبی دبی ہنسی کیساتھ بولی۔'' اس کوٹھی میں نئے نئے شفٹ ہوئے ہیں سبزے کی وجہ سے تھوڑا بہت مچھر بھی آجاتا ہے یہاں۔ ....راحیل بھی کسمسا رہے تھے'' میٹ'' سلگا کر آئی ہوں۔''

''انکل عثمانی بھی تمہارے ساتھ ہیں؟'' سرمد نے پوچھا۔

''نہیں وہ بھائی تنویر کیساتھ ہیں۔ خالہ ہمارے ساتھ ہیں۔ فلو کی دوا کھا کر گہری نیند سوئی ہیں۔''

''اتنا عرصہ فون کیوں نہیں کیا؟''

''آپکو بتایا تو ہے کہ اپنی برداشت کا امتحان لے رہی تھی۔''

''پھر کیا ہوا۔''

''ظاہر ہے کہ فیل ہو گئی۔ وہ ہنسی۔''

سرمد نے گھبرا کر کہا'' تمہاری آواز باہر تو نہیں جا رہی۔''

"یہ میرا گھر ہے مجھے پتہ ہے کہ آواز کہاں تک جاتی ہے اور کہاں تک نہیں۔" ویسے راحیل کو بھی فلو ہے وہ بھی بھاری ڈوز لے کر سوئے ہوئے ہیں۔"

سرمد نے ایک گہری سانس لی۔ تند ریلے میں پھر پاؤں جمانے کی ادھوری سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" شبانہ ! کیا ہم اس سلسلے کو بالکل ختم نہیں کر سکتے۔"

"اس نے ایک انگریزی نظم کا ٹکڑا سنا دیا........اس کا مطلب تھا کہ انسان کے ارادوں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

سرمد کو یہ پوری نظم یاد آ گئی۔ تین سال پہلے شبانہ نے متعدد بار یہ نظم گا کر سنائی تھی کسی خیال میں کھو گئے منور صاحب؟" وہ شوخی سے بولی۔

"نہیں کسی خیال میں نہیں۔"

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔" وہ چہکی۔ میں بتا دیتی ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے تھے........آپ یہ سوچ رہے تھے کہ میں یہ نظم گا کر آپ کو سنا رہی ہوں۔ کہئے ٹھیک اندازہ لگایا نا؟"

"میں نے اس لئے کہا تھا کہ تم دیوتا فرہاد علی تیمور کی رشتہ دار ہو۔"

چند سیکنڈ لائن پر دلنشین سی خاموشی طاری رہی پھر شبانہ کی چنچل آواز ابھری" کہتے ہیں تو گنگنا کر سنا دوں؟"

سرمد کے رگوں میں سنسنی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس نے اپنا اشتیاق ظاہر نہیں کیا۔ وہ اس من موجی کے سامنے خود کو پوری طرح کھولنا نہیں چاہتا تھا.....وہ خود ہی بول اٹھی۔

"میں آپ کی ہر رگ سے واقف ہوں۔"

چند سیکنڈ بعد ریسیور پر اس کی باریک دلسوز آواز ابھری۔ وہ گا رہی تھی۔

وقت رفتہ کو آواز دے رہی تھی اور سرمد کے کانوں میں رس گھل رہا تھا

گانے گنگنانے کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا شبانہ نے کئی بھولی بسری نظمیں اور غزلیں سرمد کو سنائیں۔

وہ سرمد کو اپنے بہاؤ میں بہاتی چلی جارہی تھی۔ جب بات بہت طویل ہوگئی تو سرمد نے کہا ”تم شاید بھول رہی ہو کہ موبائل فون پر بات کر رہی ہو کئی سو روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔“

”آج بہت بیلنس ہے میرے فون اکاؤنٹ میں اور مجھے یہ ساری رقم ضرور بہ ضرور خرچ کرنی ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ وہ اپنے مخصوص ہنستے ہوئے لہجے میں بولی“ سرمد کوئی مناسب جواز سوچنے لگا۔

”آپ نے آج کیا پہن رکھا ہے؟ اس نے ایک بھولا بسرا موضوع چھیڑا۔

”تم خود اندازہ لگالیا کرتی ہو۔“

”تین برس بعد ملاقات ہو تو اندازے فیل ہو جایا کرتے ہیں۔“

”اچھا تم بتاؤ کہ تم نے کیا پہن رکھا ہے.........“

وہ خوش ہو کر بولی میں نے ہلکی گلابی ساڑھی پہن رکھی ہے۔ اس پر سفید پھول ہیں اور کنارہ عنابی رنگ کا ہے............“

گلے میں سونے کی چین ہے۔ بال جوڑے کی شکل میں باندھ رکھے ہیں۔ موتیے اور گلاب کا ایک مکس ہار بھی لپیٹ رکھا ہے جوڑے پر ......آپ کو خوشبو نہیں آرہی۔“ اسنے کھلکھلا کر پوچھا۔

”خوشبوئیں تو بہت سی آرہی ہیں۔“ سرمد نے کہا۔

”ایک تو میرے پرفیوم پرڈیسی کی خوشبو ہوگی .... دوسری میری لپ اسٹک کی ہوگی.........اور تیسری خوشبو پتہ ہے کس کی ہوگی؟“

”کس کی؟“

”جناب! وہی باڈی اسپرے جو ایک عید پر آپ نے اور باجی تسلیم

نے دیا تھا وہ میں نے ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

"بہت خوب۔" سرمد نے کہا۔

"اس کے بعد شبانہ نے اپنی ہفت رنگ چوڑیوں، ہم رنگ نیل پالش، اور ہم رنگ جھمکوں کے بارے میں بھی بتایا۔

اس نے اپنے پورے کمرے کا نقشہ بھی سرمد کے سامنے کھینچا۔ یہاں دبیز ایرانی قالین تھا۔ دو جگمگاتے فانوس تھے ایک کھڑکی کو بون بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ دوسری کھڑکی سے رات کی رانی کے پودے نظر آتے تھے جو چاندنی میں نہائے ہوئے تھے۔

"اچانک شبانہ نے پوچھا "لیٹ گئے ہیں آپ؟" سرمد نے اثبات میں جواب دیا "میرا خیال ہے کہ صوفے پر لیٹے ہوں گے۔ دائیں طرف کروٹ لے رکھی ہوگی آپ نے۔"

"ہمیشہ ٹھیک اندازے لگاتی ہو۔"

چند لمحے فون لائن میں جذباتی خاموشی طاری رہی پھر شبانہ کی جھجکتی ہوئی بوجھل آواز سنائی دی۔ "میں بھی لیٹی ہوئی ہوں۔"

بھولا بسرا ہیجان سرمد کے لہو میں ہلچل مچانے لگا۔

سانسوں کی لے چڑھنے لگی۔ وہی بچگانہ کھیل تھا لیکن کس قدر حقیقی لگتا تھا آٹھ سو میل کا فاصلہ تھا اور وہ تصور ہی تصور میں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ایک دوسرے کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگے۔ کتنی دوری تھی۔ لیکن کتنا قرب تھا۔

خاندان، سماج اور رواج کی اٹھائی ہوئی ساری دیواریں ایک ہی جھٹکے میں ڈھ گئی تھیں .... وہ لیٹے رہے .... ان کی سانسوں میں سرگوشیاں ابھرتی رہی" کتنے قریب ہیں ہم۔" شبانہ کی جذبات سے بوجھل آواز ابھری۔"

"ہوں۔" سرمد نے بند ہونٹوں سے اقرار کیا۔

"آپ سیدھے لیٹ جائیں۔"

"کیوں؟"

"لیٹ جائیں ناں۔" اس نے مخمور سرگوشی کی۔

"اچھا......لیٹ گیا۔"

"آپ کے سینے پر سر رکھ لوں۔"

"رکھ لو۔"

چند لمحے بعد اس نے کہا "میرا سر آپ کے سینے پر ہے.. ہے ناں؟"

"ہوں۔" سرمد نے پھر بند ہونٹوں سے اقرار کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا "کل میرے فون کا انتظار کریں گے ناں۔"

"ہوں۔"

"بول بول کر شاید تھک گئے ہیں آپ۔ چلیں کچھ دیر اسی طرح

خاموش لیٹے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سرمد نے کہا۔

لائن پر خاموشی رہی۔ دونوں لیٹے رہے۔ ایک دوسرے کی سانسیں سنتے رہے پتا نہیں کس وقت سرمد کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو ریسیور صوفے سے نیچے لڑھکا ہوا تھا۔ اس نے بوکھلا کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو ہیلو کیا لیکن سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ شبانہ نہ جانے کب تک مجھ کو پکارتی رہی تھی۔ پھر ظاہر ہے اس نے فون بند کر دیا ہوگا۔

سرمد کو یقین تھا کہ اگلی رات شبانہ کا فون پھر آئے گا لیکن فون نہیں آیا۔ اس سے اگلی رات بھی نہیں آیا۔ اگلے دو ہفتے تک نہیں آیا۔ طویل گفتگو کے دوران سرمد نے شبانہ کا فون نمبر پوچھا تھا لیکن کہیں لکھا نہیں تھا۔ ....شاید ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ اسے پتا تھا کہ جب بھی فون کرنا ہو شبانہ خود ہی کرتی ہے اب پتہ نہیں وہ کیوں نہیں کر رہی تھی

........شبانہ کا کراچی کا ایڈریس البتہ سرمد کو زبانی یاد تھا اس دوران میں ایک دوست کے ذریعے اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی تھی کہ راحیل اور شبانہ کراچی میں مقیم ہیں۔ اس واقعے کو پورا ایک ماہ گزر گیا۔ اپنے کام کی غرض سے شبانہ کا کراچی جانا ہوا۔ اس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ راحیل اور شبانہ سے ضرور ملے گا۔ وہ اپنی ملاقات کو اتفاقیہ ملاقات کا رنگ دے سکتا ہے، بہر حال اسے اس قسم کا کوئی بہانہ بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کراچی میں اس کے قیام کا دوسرا روز تھا جب ہوٹل میں اسکے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے راحیل کو اپنے سامنے پایا۔

"ارے راحیل! تم یہاں؟" سرمد بھونچکا رہ گیا۔

"اخبار میں آپ کے بارے میں خبر پڑھی تھی۔ آپ کسی تصویری نمائش کے افتتاح میں شریک ہونے کیلئے آئے ہیں غالباً۔"

"سرمد نے تائید کی۔" رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ سرمد نے باتوں کے دوران میں ہی عمومی انداز میں شبانہ اور بچوں کے بارے میں پوچھا۔

"شبانہ کا تو پچھلے ماہ انتقال ہو گیا۔" راحیل نے کہا اور اس کا گلہ آنسوؤں کی یورش میں رندھ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" سرمد حیرت سے چیخ پڑا۔

"راحیل سسکیاں لینے لگا...... سرمد سکتے کی حالت میں بیٹھا تھا۔ وہ قیامت خیز گھڑیاں تھیں۔ قرب و جوار سرمد کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ اگلے آدھ گھنٹے میں اسے وہ سب کچھ معلوم ہو گیا جو دل کو خون کر کے آنکھوں کے راستے بہانے کیلئے کافی تھا۔ شبانہ کی موت قریباً پانچ ہفتے پہلے ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب ہوئی تھی......... سرمد کو یاد آیا یہ وہی شب تھی جب شبانہ نے اسے آخری کال کی تھی۔ قریباً پانچ گھنٹے پر مشتمل......... آخری کال۔"

سرمد نے دلگیر لہجے میں راحیل سے پوچھا ''لیکن تم نے تو آخری ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ وہ.........ٹھیک ہوگئی ہے۔''

وہ وقتی افاقہ تھا۔ چند روز بعد وہ پھر بستر سے لگ گئی تھی۔ اس کے بعد آخری سانس تک اٹھ نہیں سکی۔''

''تت.........تمہارا مطلب ہے کہ وفات کے وقت بھی وہ شدید بیمار تھی؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ پچھلے دو سال سے وہ بستر پر ہی رہی ہے آخری چار ماہ تو اس نے مسلسل اسپتال میں گزارے ہیں ہر آٹھ دس روز بعد گردے واش کرنا پڑتے تھے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ بال جھڑ گئے تھے۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ پندرہ مارچ ہفتے کی رات جب اس کا......... انتقال ہوا تو وہ اسپتال میں ہی تھی۔''

''جی ہاں.........ایک دن پہلے وہ تین گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔ آکسیجن، خون گلوکوز، پتا نہیں کیا کچھ لگا ہوا تھا اس وقت میں پرائیویٹ روم میں اس کے پاس ہی تھا۔ ہفتے کی رات مجھ سے کہنے لگی۔ آج میں کچھ ٹھیک ہوں۔ تم آج رات بچوں کو کمپنی دو۔ اس نے مجھے اصرار کر کے بھیج دیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا اس نے رات سکون سے گزارنے کے لئے۔ بے حد اصرار کر کے ''درد'' کے تین تیز انجکشن ایک نرس سے لگوائے۔ اس کے علاوہ سانس درست رکھنے والی گولیاں بھی ٹرپل ڈوز از خود پھانک لی۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ اپنی درد سے تڑپتی ہوئی زندگی کو خود بھی زیادہ طول نہیں دینا چاہتی۔ صبح کے وقت جب نرس نے دیکھا کہ وہ سفید تکیے پر اپنا سر رکھے بڑے سکون سے سو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دواؤں، مشینوں اور نالیوں میں گھرا ہوا اس کا ڈھانچہ اچانک سکون پا گیا ہے.........'' راحیل کا لہجہ ایک بار پھر

بھیگ گیا۔

سرمد کے ذہن میں آندھی چل رہی تھی تو وہ سب کیا تھا؟ اتنا بڑا جھوٹ ....ایسا مکمل فریب........وہ خوبصورت کمرا..........وہ بیلوں سے ڈھکی ہوئی کھڑکی.......وہ چاندنی میں رات کی رانی کے پودے؟ وہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی جگہ آکسیجن کی نالیاں تھی۔ خون اور گلوکوز کے جھولتے ہوئے بیگ تھے۔ خوف ناک آواز والی ٹیسٹ رپورٹوں کی پھڑ پھڑاہٹ تھی.......خالی سرنجیں داغ دار روئی کے پنے........خون آلود ٹشوز پیپرز..........اور پتہ نہیں کیا کچھ۔

پھر ایک ایک کر کے شبانہ کی ساری باتیں سرمد کو یاد آنے لگیں۔ وہ سفید پھولوں والی ساڑھی وہ باڈی اسپرے کی خوشبو، وہ لپ اسٹک وہ جھمکے.......ہفت رنگ چوڑیاں بالوں میں گندھے ہوئے موتیے اور گلاب کے پھول........یہ سب کچھ بھی نہیں تھا اس کی جگہ دوائیں

کے بو تھی۔ جھڑے جھڑے بال تھے۔ اسپتال کا دھاری دار لباس تھا اور ہڈیوں پر لمحہ بہ لمحہ اترتی موت تھی۔"

اور پھر کیا ہوا؟ اس نے سرمد سے پوچھا۔ کل میرے فون کا انتظار کریں گے نا؟" سرمد نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

پھر کیا ہوا تھا.........اسپتال کے سفید تکیے کو سرمد کا سینہ بنا کر سو گئی تھی............ہمیشہ کے لئے۔

وہ سوچتا رہا۔ عورت کیا ہے؟ کیسا معمہ ہے؟ کیسی پہیلی ہے؟ وہ سوچتا رہا اور آنسوؤں کا خاموش دریا اس کے حلق میں گرتا رہا۔

☆☆☆☆

ختم شدہ